# نگار

قیمت فی کاپی ۸ر

۱۱/

# تصانیف نیاز فتحپوری

## نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

## جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت للعہ

علاوہ محصول

## حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنادیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

## مکتوبات نیاز حصۂ اول

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور اسلوب کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں، اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

## مکتوبات نیاز حصۂ دوم

یہ حصہ پہلے حصہ سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں اکثر مکاتیب انتقادی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ حضرات جنھیں شعر و شاعری سے دلچسپی ہے انھیں ان مکاتیب میں بہت سے عجیب و غریب نکات شعری نظر آئیں گے۔ رنگین تحریر اور اسلوب ادا کی دلکشی کا ذکر فضول ہے کیونکہ حضرت نیاز کی اس خصوصیت سے ہر شخص آگاہ ہے۔ قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

## شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخییل اسکی مزاکت بیان، اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

## ترغیبات جنسی (با)

شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام نظری اور غیر نظری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں۔ نیا اڈیشن

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

## مجموعۂ استفسار و جواب مجلد

ان تینوں جلدوں میں سنہ ۱۹۲۶ء سے لیکر سنہ ۱۹۳۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ علاوہ محصول

## کتنی بار کہا جائے

کہ خط و کتابت میں نمبر خریداری درج کیا کیجئے، آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کی اس فروگزاشت سے دفتر کو کتنی تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے۔ آپ کا نمبر خریداری ہر مہینے پتہ کی چٹ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے۔ اسے کسی جگہ نوٹ کر لیجئے۔ کیا یہ کوئی بڑا مشکل کام ہے



چندہ سالانہ پانچ روپیہ
ششماہی تین روپیہ

نگراں : نیاز فتحپوری

ادارہ : مجدد نیازی
شوکت جہاں

| جلد ۴۶ | فہرست مضامین نومبر ۴۴ء | شمار ۵ |
|---|---|---|



ملاحظات ---------- ۲
انسان کی روح ---------- نظیر حیدر ---------- ۴
خانخاناں کی ہندی شاعری ---------- ڈاکٹر صمدی ---------- ۱۵
حکومت کی اقتصادی و صنعتی پالیسی ---------- حسرت نعمانی ام-اے ---------- ۲۱
پھول یا انگارے؟ ---------- محمد حسن ---------- ۲۶
چاند (ڈرامہ) ---------- انتصار نیوتنوی ---------- ۳۵
مالہ و ماعلیہ ---------- ۳۹
مسلمانوں کا دیومالا (عوج بن عنق) ---------- افادات شرر لکھنوی ---------- ۴۱
باب الاستفسار ---------- ۴۶
بعض دلچسپ معلومات ---------- ۴۸
باب المراسلۃ والمناظرہ ---------- ۴۹
مکتوبات نیاز ---------- ۵۲
تقاضا (نظم) ---------- پروفیسر شور، ام-اے ---------- ۵۴
صبحِ انقلاب (نظم) ---------- حسن یحییٰ عندلیب میرٹھی ---------- ۵۵
سہارے (نظم) .... سید علی سجاد مہر ——— غزلیں ... انجم رضوانی - نیساں اکبرآبادی ---------- ۵۶



دنیا میں کیا اندھیر ہو رہا ہے
اس کا دلچسپ حال معلوم کرنا ہو تو
"ملک خطا کے شہزادے" پڑھئے
قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

آپ اپنے خط کا جواب
نفاذ میں چاہتے ہیں تو ٹکٹ لگا کر لفافہ
بھیجئے جس پر آپ کا پتہ لکھا ہو
منیجر نگار

# ملاحظات

## آیندہ جنوری ۴۵ء کا "نگار"

میں تو ہمیشہ سے جانتا تھا کہ ہمارے اکثر علماء کرام کا مذہب بالکل اعتقادی و روایتی چیز ہے، یعنی اگر وہ سو اتفاق سے مسلم گھرانے میں پیدا نہ ہوئے ہوتے، تو سرے سے مسلمان ہی نہ ہوتے۔ لیکن علمی و تحقیقی حیثیت سے میں انھیں اتنا تہی دامن بھی نہ سمجھتا تھا کہ اگر اُن کے سامنے کبھی "انتقاد مذہب" کا سوال آیا، تو وہ لرزہ براندام ہو جائیں گے ——— میں، علماء کے نزدیک مسلمان ہوں یا کافر، اس سے بحث نہیں (کیونکہ اگر اسلام کوئی ایسی چیز ہے جو صرف علماء کی سند و دستاویز کا محتاج ہے اور اس کا ذاتی تحقیق سے کوئی تعلق نہیں، تو شاید ایسا مذہب کسی کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتا) ——— لیکن ایک انسان کی حیثیت سے میں نے جس حد تک مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ کیا ہے، اس نے میرے دل میں اسلام کی محبت ضرور پیدا کر دی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر اُن تمام اعتقادی و روایتی زوائد کو نظر انداز کر دیا جائے جنھیں غلطی سے اصل مذہب سمجھ لیا گیا ہے، تو اسلام ہی ایک ایسا مذہب رہ جاتا ہے جو زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے ——— لیکن اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ زوائد کیا ہیں اور اس امر کا فیصلہ کہ وہ واقعی زوائد ہیں یا نہیں کیونکر ہو سکتا ہے ——— ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ علم اور تاریخ کی مدد سے کیا جائے گا اور اگر اس سلسلہ میں کوئی بات ایسی سامنے آجائے جو مسلمانوں کے اعتقاد کے منافی ہو، تو ان کا فرض ہوگا کہ یا تو وہ اس علمی و تاریخی استنتاج کو غلط قرار دیں یا پھر یہ کہیں کہ یہ اعتقاد ان کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

دُنیا کے اکثر مذاہب کسی نہ کسی الہامی کتاب رکھنے کے مدعی ہیں، لیکن یہ فخر شاید صرف مسلمانوں ہی کو حاصل ہے کہ انکی الہامی کتاب میں کسی قسم کا حذف و اضافہ نہ ہونے کو غیر مسلموں نے بھی تسلیم کیا ہے، خود مسلمانوں کے نزدیک بھی اس کی اہمیت اتنی بڑی ہے کہ وہ اس کے مقابلہ میں خود "اقوال رسول" کو بھی ثانوی درجہ دیتے ہیں، اس لئے مخالفین اسلام نے ہمیشہ قرآن ہی کو سامنے رکھ کر اعتراضات کرنے کی کوشش کی، لیکن ان میں سے اکثر کا یہ دعوے بے بنیاد ثابت ہوا، کیونکہ جب ان اعتراضات کی چھان بین کی گئی تو معلوم ہوا کہ اعتراضات کی بنیاد یا تو عدم فہم قرآن پر قائم ہے یا پھر ان احادیث و تفاسیر پر جو مسلمانوں کے نزدیک بھی قابل اعتبار نہیں۔

ان معترضین میں دو بڑی جماعتیں نظر آتی ہیں ایک آریہ، دوسرے عیسائی لیکن چونکہ آریہ معترضین کا مانند یکسر عیسوی اعتراضات ہیں، اس لئے قابل توجہ صرف وہ مشنری جماعت رہ جاتی ہے جس میں واقعی بعض اچھے محقق بھی پیدا ہوئے اور جنھوں نے بعض ایسی باتیں بھی کہیں جو غور سے سننے کے قابل ہیں۔

اس وقت تک مناظرہ کی کتابوں کا جتنا ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہے، اس کا بیشتر حصہ خرافیات سے بھرا ہوا ہے،

کیونکہ اول تو ان کا لب ولہجہ تہایت نامعقول اور دوسرے اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اعتراض وجواب دونوں حیثیت سے نہایت سطحی ہے، لیکن اس انبار میں بعض چیزیں ایسی بھی نگاہ سے گزریں جو واقعی علمی حیثیت سے غور کرنے کے قابل ہیں اور اسی غور وتامل کی دعوت میں نے علماء کرام کو دی۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ اس خیال سے ان میں سے اکثر کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔

وہ کہتے ہیں کہ اعتراضات کو پہلے اور جوابات کو بعد میں شایع کرنا فتنہ سے خالی نہیں، لیکن یہ جانتے ہوئے کہ اعتراضات و جوابات کا نگار کی ایک ہی اشاعت میں پیش کرنا ممکن نہیں، ان کا یہ اصرار جو معنی رکھ سکتا ہے، ظاہر ہے۔ تاہم مجھے یہ دیکھکر اطمینان ہوا کہ دیوبند، لکھنؤ، رامپور اور پنجاب کے چھ علماء نے کوئی شرط عاید نہیں کی اور اس طرح اگر اعتراضات کا جواب دینا فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے تو یہ تعداد اس فرض کی ادائی کے لئے کافی ہے، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ میں جانتا ہوں کہ ان چھ علماء میں سے ہر ایک اپنی جگہ جواب دینے کا اہل ہے۔

جو اعتراضات میں پیش کرنے والا ہوں، وہ ایک مشہور مستشرق ڈاکٹر ٹسڈل کے ہیں جن میں انھوں نے قرآن مجید کو غیر الہامی ثابت کرنے کے لئے اس کے ماخذ سے بحث کی ہے۔ ڈاکٹر ٹسڈل نے سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں (جبکہ وہ ایران میں مشنری کی خدمت انجام دے رہے تھے) فارسی میں ایک مختصر سا رسالہ اس موضوع پر "نیابیع الاسلام" کے عنوان سے شایع کیا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ پہلی کوشش تھی جسے وہ ناتمام ظاہر کرتے ہیں، اور اسکے بعد انھوں نے زیادہ بسیط کتاب انگریزی میں شایع کی جس کا نام "The original Sources of the Quran" ہے۔

"نیابیع الاسلام" کا جواب تو احمدی جماعت کی طرف سے انگریزی میں عرصہ ہوا شایع ہوچکا ہے (اگرچہ وہ جواب کہلانے کے قابل نہیں) لیکن ٹسڈل کی اس دوسری کتاب کی طرف ابتک کسی نے توجہ نہیں کی۔

ڈاکٹر ٹسڈل نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک حصہ تو یقیناً جواب طلب نہیں، کیونکہ بجائے اعتراض کے وہ خود قرآن مجید کی حمایت ہے، لیکن بعض بعض مقامات ضرور ایسے ہیں جن پر کافی غور وخوض کی ضرورت ہے اور اسی چیز کی دعوت میں نے علمائے اسلام کو دی تھی جو اکثر کو اچھی نہ معلوم ہوئی ——— بہرحال چونکہ علماء کی ایک جماعت اعتراضات وجوابات کی علٰحدہ علٰحدہ اشاعت میں کوئی حرج نہیں پاتی اور وہ پوری دلچسپی کے ساتھ اس بحث میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہے اسلئے مجھے مسرت ہے کہ غالباً میں اپنی اس تجویز کو عمل میں لاسکوں گا اور اس طرح میں اسلام کی وہ خدمت انجام دے سکوں گا جسکی تمنا میں عرصہ سے دل میں لئے ہوئے تھا ——— نگار کی یہ اشاعت میں ان علماء کے پاس بھی بھیجوں گا، جنھوں نے میری اس تجویز کو پسند نہیں فرمایا اور مجھے امید ہے کہ اُس وقت وہ اس بحث میں وقت ضایع نہ کریں گے کہ اعتراض بلا جواب کیوں شایع کیا گیا، بلکہ وہ اصل مقصود کو سامنے رکھ کر میری اعانت فرمائیں گے، تاکہ جب یہ تمام مجموعہ (اعتراضات وجوابات کا) کلیکجا شایع ہو، تو اُنکے افادات علمیہ بھی اس میں شامل ہوسکیں ——— میں ان کے نزدیک کافر وملحد سہی، لیکن اگر انھیں خود اپنے اوپر اعتماد ہے تو یہ برافروختگی کیوں، جبکہ (قطع نظر میری نیت سے) نتیجہ خدمت اسلام ہی قرار پاتا ہے ——— ہمارے بعض علماء کا خیال ہے کہ اگر بعض اعتراضات پڑھنے والوں کے سامنے جوابات کسی وجہ سے نہ آسکے تو اس سے اور گمراہی پھیلے گی، لیکن غالباً اس سے زیادہ فکر کی بات یہ ہے کہ اگر جوابات پڑھنے کے بعد بھی وہ مطمئن نہ ہوسکے تو کیا ہوگا ——— بہرحال کوئی مطمئن ہو یا نہ ہو، لیکن کم ازکم میں اپنی کوشش کی طرف سے اپنے آپ کو ضرور مطمئن کرسکوں گا اور اگر ساری دُنیا کو مسلمان بنائے بغیر، میں خود اپنی ذات سے مسلمان رہسکا تو میرے لئے یہی کیا کم ہے۔

# انسان کی رُوح

اشتراکیت کے قیام سے بڑا فایدہ یہ ہوگا کہ ہمیں دوسروں کے لئے زندہ رہنے کے عذاب سے نجات مل جائے گی جو موجودہ حالات میں تقریباً ہر شخص کے سر پر بُری طرح مسلّط ہے۔

صدیوں کے دوران میں کبھی کبھی کوئی بڑا محقق مثلاً ڈارون، کوئی بڑا شاعر مثلاً کیٹس، کوئی اچھا نقاد مثلاً م۔ ر۔ نیان، کوئی بلند پایہ صناع مثلاً فلائبر خود کو دوسروں سے علٰحدہ اور ان کے پرشور مطالبات سے دور رکھنے میں کامیاب ہوسکا ہے۔ فلاطون کے الفاظ میں انھوں نے "دیوار کے سائے میں کھڑے ہوکر" اپنے اور دوسروں کے غیر فانی فایدوں کی خاطر ان قوتوں کی تکمیل کی جو ان کے اندر تھیں، لیکن یہ مستثنیات میں سے تھے۔ زیادہ تر لوگ اپنی زندگی غیر نفع بخش اور غیر ضروری بذل وکرم میں برباد کردیتے ہیں، بلکہ برباد کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انھیں اپنے چاروں طرف بھیانک افلاس، گندگی اور فاقہ کشی کے مناظر دکھائی دیتے ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ وہ ان سے گہرا اثر نہ لیں (انسان کے جذبات اس کی عقل سے پہلے حرکت میں آجاتے ہیں اور جیسا میں نے کچھ عرصہ قبل ایک مضمون میں ظاہر کیا تھا مصیبت سے ہمدردی کرنا بہ نسبت خیالات سے ہمدردی کرنے کے کہیں آسان ہے) اور اس طرح قابل تعریف لیکن غلط کارنیت کے ساتھ وہ نہایت مستعدی اور جذباتی طریقہ سے ان خرابیوں کا علاج کرنے میں لگ جاتے ہیں جو انھیں نظر آتی ہیں، لیکن اس سے مرض دور نہیں ہوتا۔ بلکہ بڑھ جاتا ہے اور سچ پوچھئے تو یہ دوائیں خود جزو مرض ہیں۔

مثلاً وہ افلاس کے مسئلہ کو یوں حل کرتے ہیں کہ غریبوں کو زندہ رکھا جائے۔ یا زیادہ ترقی یافتہ لوگوں کے نزدیک انھیں بہلایا جائے۔

لیکن یہ کوئی حل نہیں، یہ مشکل کو پیچیدہ بنانا ہے، صحیح مقصد یہ ہے کہ سوسائٹی کو کوشش کرکے نئے سرے سے اس طرح ترتیب دیا جائے کہ افلاس ناممکن ہوجائے، لیکن داد و دہش کی خوبیوں نے اس مقصد کو پورے ہونے سے روک رکھا ہے۔ جس طرح بدترین آفادہ تھے جو اپنے غلاموں کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے تھے، بالکل اسی طرح سب سے زیادہ نقصان انھیں لوگوں سے پہونچتا ہے جو سب سے زیادہ فایدہ پہونچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ایسی خیرات ذلت آمیز اور مخرب اخلاق ہے۔ خیرات سے گناہوں کا ایک انبار طیار ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ذاتی جائداد کو ان خرابیوں کے دور کرنے کے لئے استعمال کرنا جو ذاتی جائداد سے پیدا ہوئی ہیں منافی اخلاق ہے۔

اشتراکیت کے تحت ظاہر ہے کہ یہ سب بدل جائے گا۔ اس وقت ایسے لوگ باقی نہ ہوں گے جو متعفن سوراخوں اور ربودار چیتھڑوں میں رہ کر یکسر ناقابل برداشت اور اشتعال انگیز ماحول بیمار اور بھوک کے مارے ہوئے بچے پیدا کریں۔ آج کے

برخلاف اُس وقت سوسائٹی کی بنیاد موسم کی حالت پر قایم نہ ہوگی - اگر پالا پڑ جائے تو ایک لاکھ بیکار آدمی ناگفتہ بہ حالت میں سڑکوں پر مارے مارے نہ پھریں گے - نہ رو رو کر اپنے پڑوسیوں سے بھیک مانگیں گے نہ قابل نفرت محتاج خانوں کے سامنے دھکے دیدیکر روٹی کا ایک ٹکڑا اور رات بھر پڑ رہنے کے لئے کسی کثیف جگہ کے طالب ہوں گے - سوسائٹی کا ہر فرد سوسائٹی کے مشترکہ اطمینان اور خوشحالی میں حصہ لے گا اور اگر پالا پڑے تو عملی طور پر کسی کا بھی نقصان نہ ہوگا -

اس کے علاوہ اشتراکیت صرف اس لئے قابل قدر ہوگی کہ یہ انفرادیت کا راستہ دکھائے گی - اشتراکیت، اشتمالیت یا اور جس نام سے اسے پکارئے، ذاتی ملکیت کو قومی دولت میں بدل کر اور مقابلہ کی جگہ تعاون کو دیکر سوسائٹی کو اس کی مناسب اور صحیح حالت پر پہونچا دے گی - اس طرح جماعت کے ہر فرد کی آسایش یقینی ہو جائے گی - درحقیقت یہ زندگی کا موزوں اساس اور موزوں ماحول قایم کرے گی - لیکن زندگی کو ترقی کے اعلیٰ مراتب تک پہونچانے کے لئے اتنا ہی کافی نہیں - اسکے لئے انفرادیت کی ضرورت ہے - اگر اشتراکیت، آمریت ہو جائے، اگر حکومتیں اقتصادی قوت سے مسلح ہوں، جیسے آج وہ سیاسی قوت سے مسلح ہیں ——— اگر ہم اقتصادی استبداد کا شکار ہو گئے تو انسان کی آخری حالت اس کی اولین حالت سے بدتر ہوگی موجودہ حالت میں لوگوں کی ایک خاصی تعداد ذاتی ملکیت کے وجود کے سبب سے انفرادیت کی نشو و نما کر سکتی ہے ایسے لوگوں کو یا تو کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی یا وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ اسی کام کو اختیار کریں، جو ان کے لئے واقعی موزوں ہو - یہ شاعر، فلسفی، اہل علم یا اہل تہذیب مختصر لفظوں میں حقیقی انسان ہیں - وہ انسان جنھوں نے اپنی قیمت کو پا لیا ہے - اسکے برخلاف لوگوں کی ایک خاصی تعداد ایسی ہے جن کے پاس ذاتی جائداد نہیں ہے اور جن کو بھوک سے بچنے کے لئے بار برداری کے جانوروں کا کام کرنا پڑتا ہے، ایسا کام جو ان کو پسند نہیں اور جس کے کرنے پر غیر معقول اور ذلت آمیز احتیاج کا سخت ہاتھ مجبور کرتا ہے - یہی غریب ہیں، نہ ان کے چال ڈھال میں کوئی خصوصیت ہے نہ گفتگو میں دلچسپی، نہ تہذیب، نہ ثقافت، نہ سامان تفریح کی نفاست، نہ زندگی کا لطف - ان کی مجموعی قوت سے دُنیا بہت کچھ بہبود حاصل کرتی ہے - غریب آدمی کی خود کوئی اہمیت نہیں - وہ اس قوت کا حقیر ترین ذرّہ ہے جو اس کا خیال کرنے کے بجائے اسے کچلتی ہے - درحقیقت اس کی کچلی ہوئی حالت اس قوت کو زیادہ پسند ہے کیونکہ اس وقت وہ زیادہ فرماں بردار ہوتا ہے -

یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ انفرادیت جو ذاتی ملکیت کے ماحول میں پیدا کی جائے کچھ اعلیٰ درجہ کی نہیں ہوتی - نیز یہ کہ غریبوں میں کشش اور ثقافت نہ ہوتے ہوئے بھی بعض خوبیاں ہوتی ہیں، یہ دونوں باتیں بالکل صحیح ہیں - ذاتی جائداد کا وجود اکثر اخلاق کو پست کرنے والا ہوتا ہے اور یہ ان وجوہ میں سے ایک ہے جن کی بنا پر اشتراکیت اس نظام سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے، سچ یہ ہے کہ جائداد ایک وبال ہے، چند سال قبل لوگ تمام ملک میں یہ کہتے پھرتے تھے کہ جائداد کے ساتھ ذمہ داریاں بھی ہیں - انھوں نے اس بات کو اتنی مرتبہ دہرایا اور ایسا پریشان کیا کہ آخر کار جوچ نے اسے اپنا شروع کر دیا - اب یہ صدا ہر ممبر سے سنائی دیتی ہے - یہ بالکل سچ ہے - دولت کے ساتھ نہ صرف ذمہ داریاں ہیں بلکہ اتنی ذمہ داریاں ہیں کہ زیادہ مقدار میں اس کا مالک ہونا ایک مصیبت ہے، اسی لئے سیکڑوں حق دار کاروبار کے غیر محدود تسکرت اور بیسیوں جھگڑے آدمی کے پیچھے لگ جاتے ہیں، اگر دولت میں صرف آرام ہوتا تو ہم اسے سہ لیتے - لیکن اس کی ذمہ داریاں اسے اتنا ناقابل برداشت بنا دیتی ہیں کہ امراء کے مفاد کے مدنظر اس سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیئے - ہم کو اکثر یہ بتایا جاتا ہے کہ غریبانہ سلوک و خیرات سے

بہت خوش ہوتے ہیں - ان میں سے کچھ ضرور ایسے ہیں - لیکن غریبوں میں جو سب سے اچھے ہیں وہ کبھی خوش نہیں ہوتے - وہ ناخوش، غیر مطمئن، بیزار اور منحرف ہو جاتے ہیں - ان کا ایسا ہونا بجا ہے - خیرات ان کے نزدیک معاوضہ کا مضحکہ خیز طور پر ناکافی طریقہ ہے یا ایک ایسا جذباتی فرض جس کے ساتھ یہ بیہودہ کوشش بھی شامل ہوتی ہے کہ ان کی ذاتی زندگی پر حکومت جتائی جائے - وہ ان ٹکڑوں کے لئے جو امراء کے دسترخوان سے بچ رہتے ہیں، کیوں ممنون ہوں ؟ - انحراف انسان کی اولین خصوصیت ہے - انحراف اور بغاوت ہی کے ذریعہ سے ترقی ہو سکتی ہے - بعض اوقات غریبوں کی کفایت شعاری کی تعریف کی جاتی ہے - لیکن غریبوں کو پس انداز کرنے کی نصیحت کرنا مہمل بھی ہے اور توہین آمیز بھی - یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک فاقہ کش انسان کو کم کھانے کی ہدایت کرنا - آدمی کو یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ایک نیم گرسنہ جانور کی طرح رہ سکتا ہے اسکو اس طرح رہنے سے انکار کر دینا چاہئے - جہاں تک بھیک مانگنے کا سوال ہے - چھین لینے سے مانگ لینا زیادہ محفوظ ہے، لیکن چھین لینا مانگنے سے زیادہ شاندار بات ہے - ایک غریب آدمی فضول خرچ - غیر مطمئن اور منحرف ہو ایک بڑی شخصیت ہے - اور بہت کچھ اپنے اندر رکھتا ہے - وہ اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک احتجاج تو ہے - نیک اور سیدھے غریبوں پر آدمی ترس تو البتہ کھا سکتا ہے لیکن ان کی تعریف نہیں کر سکتا - انھوں نے اپنے پیدائشی حقوق کو نہایت ذلیل آب گوشت کے بدلہ میں بیچ دیا ہے، وہ غالباً حد سے بڑھ کر بیوقوف بھی ہیں، ان قوانین کو جو ذاتی ملکیت کی حفاظت کی اجازت دیتے ہیں اسوقت تک تسلیم کیا جا سکتا ہے جب تک ایک شخص ان حالات کے ماتحت ذہنی حیثیت سے بلند زندگی بسر کرتا ہے لیکن اگر ایسا نہیں تو پھر یہ قوانین مہمل ہیں -

اس مسئلہ کا حل کچھ مشکل نہیں بات یہ ہے کہ مصیبت اور افلاس آدمی کو ایسا صریحی طور پر ذلیل بنا دیتے ہیں اور اسکی فطرت کو اس طرح مفلوج کر دیتے ہیں کہ اس کو اپنی ذلت کا احساس نہیں رہتا - مزدوروں کے بڑے بڑے مالک شورش پسندوں کے خلاف جو کچھ کہتے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے - شورش پسند جماعت ایک بیجا دخل اندازی کرنے والی جماعت ہے - یہی وجہ ہے کہ شورش پسند اس قدر ناگزیر ہیں، ان کے بغیر ہماری نامکمل حالت میں ترقی ہونا ممکن نہ تھا امریکہ میں غلامی بند کی گئی تو غلاموں کی کوشش کی بنا پر نہیں بلکہ محض بوسٹن اور چند دوسرے مقامات کے شورش پسندوں کی خلاف قانون حرکات کی وجہ سے جو نہ خود غلام تھے نہ غلاموں کے مالک تھے نہ درحقیقت اس معاملہ سے کچھ تعلق رکھتے تھے اور یہ بات تعجب سے سننے کی ہے کہ خود غلاموں نے ان کی مدد نہیں کی اور جب لڑائی کے خاتمے پر غلام آزاد ہوئے تو سچ مچ ایسے آزاد ہوئے کہ فاقوں مرنے کے لئے کھلے چھوڑ دئے گئے - ان میں سے اکثر نئی حالت پر متاسف تھے -

اس طرح یہ واضح ہو گیا کہ مارے باندھے کی اشتراکیت سے کام نہیں چلتا - ہر چند یہ بات قابل افسوس ہے کہ قوم کا ایک حصہ عملی طور پر غلامی میں مبتلا ہو - لیکن پوری قوم کو غلام بنا کر اس مشکل کا حل کرنا بچوں کی سی بات ہے - ہر شخص کو آزاد ہونا چاہئے کہ وہ اپنے کام کا انتخاب خود کرے - اس پر کسی قسم کا دباؤ نہ پڑنا چاہئے - اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس کا کام نہ اس کے لئے اچھا ہوگا نہ دوسروں کے لئے - کام سے میری مُراد کسی طرح کا مشغلہ ہے -

میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی اشتراکی سنجیدگی سے یہ رائے دے گا کہ ایک افسر روزانہ صبح کو گھر پر جا کر یہ دیکھے کہ ہر شخص آٹھ گھنٹے کام کرتا ہے یا نہیں کیونکہ انسانیت اس منزل سے نکل آئی ہے، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ بعض اشتراکی نظریے جن سے

میرا سابقہ پڑا، اگر جبر نہیں تو تحکم کے رنگ میں رنگے ہوئے ضرور ہیں اور اشتراک ہمیشہ رضا کارانہ ہونا چاہئے۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ انفرادیت کو جو اب اپنی نشو و نما کے لئے کم و بیش ذاتی ملکیت کی محتاج ہے اس ذاتی ملکیت کی تنسیخ سے کیا فایدہ ہوگا۔ اس کا جواب بہت صاف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ حالات میں چند آدمی جنھیں ذاتی ذرائع میسر تھے مثلاً بائرن، شیلی، براؤننگ، وکٹر ہیوگو وغیرہ اپنی قیمت کو پورے طور پر پا سکے ہیں۔ ان میں سے ایک نے بھی کبھی دن بھر کا کام اُجرت پر نہیں کیا۔ انھیں افلاس سے نجات مل گئی تھی۔ انھیں بہت بڑا فایدہ حاصل تھا۔ سوال یہ ہے کہ آیا اس طرح کے فایدہ کا بند ہو جانا انفرادیت کے لئے مفید ہوگا۔ فرض کیجئے یہ بند ہو جائے تو اس کا اثر انفرادیت پر کیا پڑے گا؟

اس کا اثر یہ پڑے گا کہ نئے حالات میں انفرادیت کہیں زیادہ آزاد، عمدہ اور شدید ہوگی۔ میں متذکرہ بالا قسم کے شاعروں کی تخئیلی طور پر حاصل شدہ انفرادیت کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، بلکہ اس عظیم، واقعی انفرادیت کا جو عام طور پر انسانیت میں پوشیدہ ہے۔ اس لئے کہ ذاتی ملکیت کے رواج نے دراصل انفرادیت کو نقصان پہونچایا ہے اور انسان کو اس کے مقبوضات میں چھپا دیا ہے۔ یہاں تک کہ آدمی سمجھنے لگا "رکھنا" اصل چیز ہے اور یہ نہ جان سکا کہ "ہونا" اصل چیز ہے۔ انسان کی تکمیل اس سے نہیں ہوتی کہ اس کے پاس بہت کچھ ہے بلکہ اس سے کہ وہ کیا ہے۔ ذاتی جائداد نے انفرادیت کو کچل دیا ہے اور ایک جھوٹی انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ اس نے جماعت کے ایک حصہ کو بھوکا رکھ کر انفرادیت کا راستہ بند کر دیا ہے۔ اس نے جماعت کے دوسرے حصہ کو غلط راہ پر لگا کر اور اس پر بار ڈال کر انفرادیت حاصل کرنے سے روک دیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ انسان کی شخصیت اس کی ملکیت میں اس طرح جذب ہو گئی ہے کہ انگریزی قانون نے انسان کی ذات کے خلاف جرائم کی بہ نسبت مال کے خلاف جرائم کو ہمیشہ زیادہ اہمیت دی ہے اور آج بھی ملکیت مکمل شہریت کا معیار ہے۔ جائداد پیدا کرنے کے لئے جو کاروبار ضروری ہے، وہ بھی نہایت ذلیل بنانے والا ہے۔ ہماری ایسی قوم میں جہاں جائداد غیر معمولی امتیاز اور عزت و وقعت بخشتی ہے، انسان دولت اکٹھا کرنا اپنا واحد مقصد بنا لیتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ جمع کر لینے کے بعد بھی جس کی اسے ضرورت ہو سکتی ہے یا جس کو وہ صرف کر سکتا ہے یا جس سے لطف اُٹھا سکتا ہے یا جس کو محسوس کر سکتا ہے خود تھک کر اور دوسروں کو شل کر کے جمع کرتا چلا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ حالت خطرہ سے بھی خالی نہیں۔ ایک دولتمند تاجر کی زندگی ان چیزوں کے رحم و کرم پر موقوف ہے جن پر اس کا اختیار نہیں۔ اگر ہوا ذرا زیادہ چل جائے۔ موسم بدل جائے یا کوئی معمولی سا واقعہ پیش آجائے تو ہو سکتا ہے کہ اس کا جہاز ڈوب جائے، اس کا سٹہ خراب ہو جائے اور وہ محتاج ہو جائے، سماج میں اس کی عزت جاتی رہے درانحالیکہ انسان کو خود اس کے سوا کسی اور چیز سے نقصان نہیں پہونچنا چاہئے۔ اسے ہرگز کسی طرح لوٹا نہ جانا چاہئے۔ آدمی کے پاس حقیقتاً وہی سب کچھ ہے جو اس کے اندر ہے، جو کچھ باہر ہے اسے غیر اہم ہونا چاہئے۔

ذاتی جائداد کی تنسیخ کے ساتھ اس طرح ہمیں خوبصورت اور صحت بخش انفرادیت نصیب ہوگی، ہر شخص بنے گا اور جینا دُنیا میں سب سے زیادہ کمیاب چیز ہے۔

سوال ہو سکتا ہے کہ کیا آرٹ کی خیالی سطح کے علاوہ شخصیت کا پورا اظہار کسی اور طرح دیکھا گیا ہے؟ ماسیس کہتا ہے کہ قیصر مکمل اور واقعی انسان تھا۔ لیکن افسوس قیصر کی حالت کس قدر مخدوش تھی۔ جہاں کہیں ایک شخص حکم چلانے والا ہوتا ہے وہیں ایک شخص سرتابی کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ قیصر بہت مکمل تھا لیکن اس کی تکمیل ضرورت سے زیادہ خطرناک راہ چلی۔ مارکس آریلیس

مکمل انسان تھا۔ رینان کہتا ہے — یہ جلیل المرتبت شہنشاہ مکمل انسان تھا۔ لیکن اس پر کتنے لاانتہا اور ناقابل برداشت مطالبات تھے۔ وہ سلطنت کے بوجھ کے نیچے کانپ جاتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اتنے بڑے کرہ کا بوجھ اُٹھانے کے لئے ایک آدمی کسقدر ناکافی ہے۔ مکمل آدمی سے میری مراد وہ شخص ہے جو معیاری حالات میں نشوونما پائے، یا خطرہ میں گھرا ہوا نہ ہو۔ اکثر شخصیتیں باغی بننے پر مجبور ہوتی ہیں لیکن ان کی نصف قوت تصادم میں برباد ہوجاتی ہے۔ مثال کے لئے بائرن کی شخصیت کو لیجئے جو انگریزوں کی کج فہمی، بناوٹ اور بدمزاقی سے ضایع ہوگئی اور بائرن ہمیں کبھی وہ نہ دے سکا جو دے سکتا تھا۔ شیلی زیادہ اچھا رہا۔ کیونکہ وہ اتنا مشہور نہ تھا۔ اگر انگریزوں کو ذرا بھی معلوم ہوتا کہ وہ کتنا بڑا شاعر ہے تو وہ پوری طرح اس پر جھک پڑتے اور زندگی کو اس کے لئے ناقابل برداشت بنا دیتے۔ لیکن وہ سوسائٹی میں زیادہ نمایاں نہ تھا اس لئے ایک حد تک بچ گیا۔ اسکے باوجود شیلی کا نغمۂ بغاوت کبھی کبھی حد سے زیادہ تیز ہوجاتا ہے۔

انسان کی شخصیت، اگر کبھی ہم اسے پالیں گے، عجیب و غریب چیز ہوگی۔ وہ سادگی کے ساتھ فطری طور پر بڑھے گی، وہ کبھی غیر متوازن نہ ہوگی۔ کبھی تکرار یا جھگڑا نہ کرے گی۔ وہ چیزوں کو ثابت نہ کرے گی۔ بلکہ ہر چیز سے واقف ہوگی۔ تحصیل علم میں اس کی قیمت مادی چیزوں سے نہ ناپی جائے گی۔ اس کے پاس کچھ نہ ہوگا اور اس کے باوجود اس کے پاس بہت کچھ ہوگا۔ اور خواہ کوئی اس میں سے کچھ ہی لے لے، اس میں پھر بھی بہت کچھ باقی رہے گا۔ وہ غنی ہوگی، وہ کبھی دوسروں کے درمیان میں دخل نہ دیگی اور نہ ان سے اپنا جیسا ہوجانے کا مطالبہ کرے گی۔ وہ ان سے اس لئے محبت کرے گی کہ وہ اس سے مختلف ہوں گے اور دوسروں کے درمیان میں نہ پڑتے ہوئے بھی وہ سب کی مدد کرے گی۔ انسان کی شخصیت تعجب خیز ہوگی، اتنی ہی تعجب خیز جتنی ایک بچّے کی نہ وہ ماضی کے متعلق سوچے گی اور نہ اسے یہ پرواہ ہوگی کہ کچھ خاص واقعات اس کو پیش آئے تھے یا نہیں۔ وہ اپنے قوانین کے علاوہ کوئی قانون نہیں مانے گی اور نہ اپنے حکم کے علاوہ کسی کا حکم۔ "خود کو پہچانو"، قدیم دُنیا کے دروازہ پر لکھا ہوا تھا، نئی دُنیا کے دروازہ پر لکھا ہوگا "خود بنو"

عیسیٰ کا قول ہے: "تمھیں جائداد کو خیرباد کہہ دینا چاہئے"؛ یہ تم کو اپنی تکمیل حاصل کرنے سے روکتی ہے۔ یہ تم سے چمٹی ہے۔ یہ ایک بوجھ ہے، تمھاری شخصیت کو اس کی ضرورت نہیں۔ تم جو کچھ ہو اور جس کی تمھیں حاجت ہے اسے باہر نہیں اپنے اندر ہی پاؤگے"۔ جب لوگ دنیا میں نکلتے ہیں تو دنیا ان کی مخالفت کرتی ہے، کیونکہ دنیا انفرادیت سے نفرت کرتی ہے، لیکن انھیں اس سے پریشان نہ ہونا چاہئے۔ انھیں اپنے سے غرض رکھنا چاہئے۔ اگر کوئی ان کی عبا لے لے تو انھیں اپنی قبا بھی اس کے حوالے کردینا چاہئے، تاکہ یہ ظاہر ہوجائے کہ مادی چیزوں کی کچھ اہمیت نہیں۔ اگر لوگ ان کو گالی دیں تو انھیں جواب نہ دینا چاہئے۔ اس کی حقیقت ہی کیا ہے۔ لوگ کسی کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں اس سے وہ بدل نہیں جاتا، وہ وہی ہے جو ہے۔ زبان خلق کی ہرگز کوئی قیمت نہیں۔ اگر لوگ تشدد سے کام لیں تو بھی اسے تشدد پسند نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ وہ بھی اسی سطح پر اتر آئے۔ آدمی قید خانہ میں بھی آزاد ہوسکتا ہے۔ اس کی شخصیت مطمئن ہوسکتی ہے۔ وہ پرسکون رہ سکتا ہے۔ سب سے بڑھکر اسے دوسروں کے کام میں دخل دینے یا ان پر محاکمہ کرنے کی ضرورت نہیں، شخصیت بہت پراسرار چیز ہے۔ آدمی کے متعلق ہمیشہ اس کے افعال سے اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ ممکن ہے وہ قانون کو برقرار رکھے اور اس کے باوجود بیکار ہو۔ ممکن ہے وہ قانون شکنی کرے اور اس کے باوجود شاندار ہو۔ وہ کبھی کوئی برائی کئے بغیر برا ہوسکتا ہے وہ سوسائٹی کے خلاف کوئی گناہ

کرکے بھی اسی گناہ کے ذریعہ اپنی حقیقی تکمیل حاصل کرسکتا ہے۔

ایک عورت تھی جو بھاگ گئی۔ ہمیں اس کی محبت کی داستان نہیں معلوم۔ لیکن وہ محبت شدید رہی ہوگی کیونکہ عیسیٰ نے اس سے کہا کہ اس کے گناہ اسے بخش دئے گئے۔ نہ اس لئے کہ اس نے توبہ کی تھی بلکہ اس لئے کہ محبت نہایت شدید اور تعجب خیز تھی۔ عرصہ کے بعد، موت سے چند دن پہلے، جب عیسیٰ ایک دعوت میں بیٹھے ہوئے تھے وہ عورت آئی اور انکے سر پر بیش قیمت خوشبو کی چیزیں ڈالیں، عیسیٰ کے دوستوں نے اسے روکنا چاہا اور کہا کہ یہ زیادتی ہے، جو روپیہ خوشبو میں صرف ہوا وہ خیرات یا اسی طرح کے کسی کام میں صرف کیا جانا چاہیئے تھا۔ عیسیٰ نے اس رائے کو تسلیم نہیں کیا اور بتایا کہ انسان کی مادی ضروریات سخت اور دائمی ہیں لیکن اس کی روحانی ضروریات اس سے بھی زیادہ بڑی ہیں۔ نیز یہ کہ ایک مبارک لمحہ میں ایک شخصیت خود اپنے اظہار کی صورت منتخب کرکے اپنے کو مکمل بنا سکتی ہے۔ دُنیا آج بھی اس عورت کو ایک ولی کی طرح مانتی ہے۔

بالکل صحیح انفرادیت میں بہت سی اشاراتی چیزیں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اشتراکیت کو لیجئے جو گھریلو زندگی کو ختم کردیتی ہے، ذاتی ملکیت کی تنسیخ کے ساتھ شادی اپنی موجودہ صورت میں باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ پروگرام کا ایک جزو ہے۔ انفرادیت اسے تسلیم کرتی اور اعلیٰ بناتی ہے۔ یہ قانونی پابندی کی تنسیخ کو آزادی کی ایسی صورت میں بدل دیتی ہے جو شخصیت کی پوری ترقی میں مدد دے گی۔ اور مرد و عورت کی محبت کو زیادہ حیرت ناک، زیادہ خوبصورت اور زیادہ شریفانہ بنائے گی۔ عیسیٰ اس سے واقف تھے۔ انھوں نے خانگی زندگی کے مطالبات کو ٹھکرا دیا۔ حالانکہ یہ ان کے زمانہ و قوم میں صاف طور پر موجود تھے۔ جب انسے کہا گیا کہ وہ ملنا چاہتے ہیں تو اس نے پوچھا "میری ماں کون ہے؟" "میرے بھائی کون ہیں؟" جب اس کے رفیقوں میں سے ایک نے جاکر اپنے باپ کو دفن کرنے کی اجازت مانگی تو اُنھوں نے یہ ڈراؤنا جواب دیا "مردے مردوں کو دفن کرلیں گے" وہ شخصیت پر کوئی مطالبہ عاید کئے جانے کو گوارا نہ کرسکتا تھا۔

پس وہ جو عیسیٰ کی سی زندگی گزارنا چاہتا ہے وہی ہے جو پورے طور پر اور سب سے بڑھ کر خود آپ ہے۔ خواہ وہ ایک بڑا شاعر ہو یا ایک بڑا عالم۔ خواہ جامعہ کا نوعمر طالب علم ہو یا میدان میں بھیڑوں کا رکھوالا، خواہ شیکسپیئر کی طرح ڈرامہ نویس ہو یا اسپنوزا کی طرح مفکر حق، خواہ باغ میں کھیلنے والا بچہ ہو یا سمندر میں جال ڈالنے والا ماہی گیر۔ جب تک وہ اپنے اندر روح کی تکمیل حاصل کر رہا ہے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کیا ہے۔ اخلاق اور زندگی میں ہر طرح کی تقلید بے ایمانی ہے۔ آج یروشلم کی گلیوں میں ایک شخص رینگتا پھرتا ہے جو پاگل ہے اور اپنے کاندھے پر ایک چوبی صلیب لئے ہوئے ہے۔ یہ ان زندگیوں کا نشان ہے جو تقلید سے تباہ ہوتی ہیں۔ ڈیمین راہب جب جذامیوں کی بستی میں رہنے کے لئے گیا تو وہ عیسیٰ کا پیرو تھا کیونکہ اس خدمت میں وہ اس چیز کو حاصل کر رہا تھا جو اس کے اندر سب سے اچھی تھی۔ لیکن وگنر سے زیادہ مسیح کا پیرو نہ تھا جس نے اپنی روح کو موسیقی میں پالیا۔ نہ شیلی سے زیادہ جس نے اپنی روح کو گیتوں میں پایا۔ آدمی کے لئے ایک نمونہ نہیں ہے۔ تکمیل کی اتنی ہی شکلیں ہیں تقلید جتنے نامکمل آدمی ہیں اور گو ایک شخص خیرات کے مطالبات کو پورا کرکے آزاد رہ سکتا ہے مگر رواج کے مطالبات کی پابندی کرکے کوئی آزاد نہیں رہ سکتا۔

اس طرح انفرادیت وہ ہے جسے ہم اشتراکیت کے ذریعہ حاصل کریں گے۔ اس کا قدرتی نتیجہ ہوگا کہ حکومت کو حکمرانی کا

خیال ایک قلم ترک کر دینا پڑے گا، جیسے عیسیٰ سے صدیوں پہلے ایک حکیم نے کہا تھا "آدمی کو اس کی حالت پر چھوڑ دینا تو ممکن ہے لیکن آدمی پر حکومت کرنا بے معنی ہے"۔ حکومت کے تمام طریقے ناکامیاب ہیں۔ مطلق العنانی، ہر شخص کے ساتھ بے انصافی ہے اور جمہوریت کا مطلب عوام کا عوام کو ستانا ہے۔ وہ شخص جو آزاد رہنا چاہتا ہے۔ ایک بہت اچھے مفکر کا قول ہے "اسے کسی رسم کی پابندی نہیں کرنا چاہیئے" اور تحکم دوسروں کی پابندی کی ترغیب دلا کر ہم میں ایک نہایت بھدا وحشیانہ پن پیدا کر دیتا ہے۔

تحکم کے ساتھ سزا بھی اُٹھ جائے گی۔ یہ بڑا فایدہ ہے۔ درحقیقت ایسا فایدہ جس کی اہمیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں۔ تاریخ کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کا دل بُروں کے کئے ہوئے جرائم سے نہیں بلکہ اچھوں کی دی ہوئی سزاؤں سے پک جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جتنی زیادہ سزا دیجاتی ہے اتنی ہی زیادہ جرائم میں ترقی ہوتی ہے۔ جدید ترین قانون سازی نے اسے تسلیم کر لیا ہے اور سزا دہی کو حتی الامکان کم کرنا تجویز کیا ہے۔ جہاں کہیں اس نے واقعی اسے کم کر دیا ہے وہاں نہایت خوشگوار نتائج پیدا ہوئے ہیں۔ جتنی کم سزائیں اتنے ہی کم جرائم۔ جہاں سزا قطعی نہ ہو وہاں جرائم کا وقوع یا تو بالکل بند ہو جائے گا یا اگر ہوگا تو اس کا علاج کیا جائے گا۔ اس لئے کہ آجکل جنھیں مجرم کہا جاتا ہے وہ مجرم ہیں نہیں۔ آجکل کے جرائم کا سبب ذوق معصیت نہیں بلکہ فاقہ کشی ہے۔ جب ذاتی ملکیت منسوخ ہو جائے گی تو جرم کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ ضرور ہے کہ تمام جرم جائداد ہی سے متعلق نہیں ہوتے، لیکن ایک جرم باوجودیکہ وہ جائداد کے خلاف نہ ہو اس مصیبت، غصہ اور پستی سے پیدا ہو سکتا ہے جو ہمارے تقسیم جایداد کے غلط طریقہ کی پیداوار ہے اور اس لئے اس تقسیم کے اُٹھنے کے ساتھ غائب ہو جائے گا۔ جب جماعت کے ہر فرد کے پاس اپنی ضروریات کے لئے کافی ہوگا اور کوئی اس کے کام میں دخل نہ دے گا تو اسے دوسروں کے چھیڑنے میں بھی کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ حسد جو موجودہ زمانہ میں جرایم کا ایک بڑا سرچشمہ ہے ایسا جذبہ ہے جو ہماری جائداد کے تصور سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہے اور اشتراکیت وانفرادیت کے ماتحت فنا ہو جائے گا۔ یہ خیال رکھنے کی بات ہے کہ اشتمالی قبیلوں میں حسد کو کوئی جانتا بھی نہیں۔

اب غور طلب یہ ہے کہ جب حکومت انتظام نہیں کرے گی تو کیا کرے گی؟ حکومت ایک رضا کارانہ انجمن ہوگی جو مزدوروں کی تنظیم کرے گی، حکومت وہ چیزیں بنائے گی جو مفید ہیں۔ صرف وہ چیزیں جو خوبصورت ہیں۔

اب تک آدمی ایک حد تک مشین کا غلام رہا ہے اور یہ ایک دردناک واقعہ ہے کہ جیسے ہی آدمی نے اپنا کام کرانے کے لئے مشین ایجاد کی وہ بھوکوں مرنے لگا۔ ایک آدمی اس مشین کا مالک ہوتا ہے جو پانچ سو آدمیوں کا کام کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پانچ سو آدمی بے کار ہو جاتے ہیں اور کوئی کام نہ ہونے کی وجہ سے چوری کرنے لگتے ہیں۔ ایک شخص مشین کی تمام پیداوار حاصل کر کے جمع کر لیتا ہے اور جتنا اس کو ملنا چاہیئے اس سے پانچ سو گنا اور اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ حاصل کر لیتا ہے۔ اگر وہ مشین سب کی ملکیت ہوتی تو سب کو اس سے فایدہ پہونچتا۔ یہ بات جماعت کے لئے بڑی بہبودی کا باعث ہوتی۔ تمام غیر ذہنی کام تمام یکساں اور اس کام، تمام وہ کام جو ڈراؤنی چیزوں سے متعلق ہیں اور جس میں غیر دلچسپ حالات سے سابقہ پڑتا ہے مشینری سے ہونا چاہیئے۔ مشینری کو ہمارے بجائے کوئلہ کی کانوں میں کام کرنا چاہیئے، اسٹیمروں میں انجن جھونکنا، سڑکوں پر جھاڑو دینا، بارش کے ایام میں پیغام پہونچانا اور ہر وہ کام کرنا چاہیئے جو غیر دلچسپ اور تکلیف دہ ہو۔ آجکل تو مشین آدمی سے مقابلہ کرتی ہے لیکن مناسب حالات میں وہ آدمی کی خدمت کرے گی۔ جب ذی علم لوگوں کو اس کی ضرورت نہ ہوگی کہ

وہ بھوکوں مرنے والوں کو خراب غذا اور بری پوشش تقسیم کریں، تو انھیں ایجاد کرنے کے لئے اطمینان سے وقت ملے گا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جماعت مشینری کی تنظیم کرکے مفید اشیاء مہیا کرے گی۔ ایک شخص جو دوسروں کے لئے ان کی ضروریات اور خواہشات کا خیال رکھ کر چیزیں بناتا ہے دلچسپی سے کام نہیں کرسکتا۔ اور لازمی طور پر اپنی بہترین قوتیں اس کام میں منتقل نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ جب کوئی جماعت یا جماعت کا کوئی بااثر طبقہ یا کسی طرح کی حکومت صناع کو احکامات دینے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ کیا کرے، تو فن یا تو بالکل غائب ہو جاتا ہے یا نقالی بن کر ادنیٰ درجہ کا پیشہ رہ جاتا ہے۔ الغرض ایک صناع صناع نہیں رہتا ـــــ آرٹ انفرادیت کی حسین ترین صورت ہے اور پبلک اس پر قابو حاصل کرنا چاہتی ہے اور وہ ہمیشہ فن سے، عام پسند ہونے کی، ان کی بدمذاقی کو پورا کرنے کی، ان کے مہمل غرور کو بڑھانے کی، انھیں وہ بتانے کی جو پہلے بتایا جاچکا ہے، وہ دکھانے کی جسے دیکھتے دیکھتے انھیں تھک جانا چاہئے تھا، اور جب وہ اپنی حماقتوں سے عاجز آجائیں تو انکے خیالات بٹانے کی توقع کرتے ہیں۔ مگر حسن کو کبھی عام پسند بننے کی کوشش نہ کرنی چاہئے۔ عوام کو حسن کے محسوس کرنے کی اہلیت پیدا کرنا چاہئے۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ اگر ایک عالم کو یہ بتایا جائے کہ اس کے تجربوں کا ماحصل اور وہ نتیجے جنھیں وہ اخذ کرتا ہے ایسے ہونے چاہئیں جو اس مبحث خاص پر تسلیم شدہ عقاید کو تہ و بالا نہ کردیں، نہ عام تعصبات کو چھیڑیں، نہ ان لوگوں کے جذبات کو مجروح کریں جو ان علوم کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ اگر ایک فلسفی سے کہا جائے کہ وہ خیال کے گہرے سے گہرے دریا میں غوطہ لگا سکتا ہے، فکر کی بلند سے بلند سطح تک طبع آزمائی کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ انھیں نتائج پر پہونچے جن پر وہ لوگ پہونچ چکے ہیں جنھوں نے کبھی کسی بات کے متعلق کچھ نہیں سوچا تو آج کا عالم اور فلسفی اس پر ہنسے گا۔ ہر چند اب ہم ایک حد تک غور و تفکر میں عوام یا حکومت یا مذہب کی دخل اندازی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ لیکن تخئیلی فن میں دخل دینے کی کوشش اب بھی باقی ہے بلکہ باقی رہنے سے بھی زیادہ ہے۔

انگلستان میں وہ فنون جو بچے رہے، وہی ہیں جن میں عوام دلچسپی نہیں لیتے۔ میری مراد ایسی چیزوں سے ہے جیسے شاعری۔ ہم بہت نفیس شاعری پیش کرسکے ہیں اس لئے کہ عوام اس میں کچھ دلچسپی نہیں لیتے۔ عوام شعراء کی توہین اس لئے کرنا چاہتے ہیں کہ وہ متفرد ہیں، لیکن ایک مرتبہ توہین کرکے ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ناول اور ڈرامہ کے باب میں جو عوام کی دلچسپی کے فن ہیں پسند عام کے دباؤ کا نتیجہ نہایت مضحکہ خیز ہوا ہے، کسی ملک میں اتنے خراب لکھے ہوئے افسانے ناول کی صورت میں ایسا تھکانے والا معمولی سامان، اس قدر بیہودہ اور حماقت آمیز ڈرامے نہیں ہیں جیسے انگلستان میں۔ ایسا ہونا لازمی تھا۔ ایک عام پسند ناول نویس ہونا بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی، آسان اس لئے کہ پبلک کی ضروریات جہاں تک کہ قصہ، طرز ادا، نفسیات، تصور حیات و ادب کا تعلق ہے ادنیٰ ترین لیاقت اور نہایت غیر تربیت یافتہ دماغ کے بس میں ہیں۔ مشکل اس لئے کہ ایسی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے صناع کو اپنی طبیعت پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ ڈرامہ کے بارہ میں حالت ذرا اس سے بہتر ہے، تھیٹر جانے والے بدیہیات کو پسند کرتے ہیں، اس لئے مزاحیہ ڈرامے سب سے زیادہ مقبول ہیں اور ان کے لئے انگلستان کے صناع کو بہت کافی آزادی دیجاتی ہے۔ لیکن جب آدمی ڈرامے کی اعلیٰ اقسام تک پہونچتا ہے تب عوام الناس کے دباؤ کا پتہ چلتا ہے۔ عوام جدت کو بہت ناپسند کرتے ہیں کیونکہ وہ اس سے ڈرتے ہیں، عوام، فن میں جو کچھ ہو چکا ہے، اسے تسلیم کرلیتے ہیں کیونکہ اسے وہ بدل نہیں سکتے۔ وہ ہمیشہ ایک مصنف و نقاش سے پوچھتے رہتے ہیں کہ وہ فلاں کی طرح کیوں نہیں لکھتا وہ

فنان کی طرح کیوں نہیں نقش کھینچتا بغیر اس کو سمجھے ہوئے کہ اگر ان میں سے ایک بھی ایسا کرے تو وہ صناع نہیں رہ سکتا حسن کا ہر نیا پیرایہ انھیں ناگوار ہوتا ہے اور جب کبھی وہ سامنے آتا ہے تو وہ اس قدر ناخوش ہو جاتے ہیں کہ ہمیشہ دو ہی جملے استعمال کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ فن کا یہ نمونہ ناقابل فہم ہے، دوسرا یہ کہ فن کا یہ نمونہ مخرب اخلاق ہے۔ جب وہ کسی چیز کو مخرب اخلاق قرار دیتے ہیں تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ صناع نے کوئی حسین چیز بنائی ہے۔ پہلے جملہ کا تعلق بیان سے ہے دوسرے کا موضوع سے۔ لیکن سچے صناع کے کام میں اس سے بالکل خلل نہیں پڑتا۔

پچھلے چند سالوں میں فن کو گالیاں دینے کے لئے عوام کے پاس دو فقروں کا اور اضافہ ہوا ہے ایک "غیر صحت بخش" دوسرا "نا مانوس"۔ بیان کے نقطۂ نظر سے صحت بخش آرٹ وہ ہے جس کا بیان اس کی خوبصورتی کا احساس پیدا کرتا ہے اور خوبصورتی کو صناعانہ اثر پیدا کرنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے صحت بخش فن وہ ہے جس کے موضوع کی نوعیت صناع کی طبیعت سے پیدا ہو۔ صحت بخش آرٹ، مختصر لفظوں میں وہ ہے جس میں تکمیل اور شخصیت دونوں پائی جائیں۔ اسکے برخلاف غیر صحت بخش فن کا نمونہ وہ ہے جس کا بیان نافرسودہ اور معمولی ہو اور جس کا موضوع بالارادہ منتخب کیا جائے، اس لئے نہیں کہ صناع کو اس سے دلچسپی ہے بلکہ اس لئے کہ لوگ اسے معاوضہ دیں گے۔

میں پہلے دکھا چکا ہوں کہ وہ فن جو انگلستان میں سب سے زیادہ محفوظ رہے وہی ہیں جن سے عوام کو دلچسپی نہیں تھی۔ بہر حال انھیں ڈرامہ سے دلچسپی ہے اور چونکہ گزشتہ دس پندرہ سال کے اندر ڈرامہ میں کچھ ترقی ہوئی ہے لہذا یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ یہ ترقی تمام و کمال چند مخصوص صناعوں کی مرہون منت ہے جنھوں نے عوام میں مذاق کی کمی کو اپنا معیار بنانے اور فن کو محض مانگ اور رسد کا کھیل سمجھنے سے انکار کر دیا۔

ناول کا حال بھی ایسا ہی ہے۔ عوامی تحکم اور عوامی تحکم کا تسلیم کر لینا سم قاتل ہے۔ تھیکرے کا "ایسمنڈ" فن کا ایک خوبصورت کارنامہ ہے کیونکہ اس نے اسے محض اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے لکھا تھا۔ اپنے دوسرے ناولوں میں اسے اکثر اوقات پبلک کا زیادہ احساس رہتا ہے اور اس طرح اپنے کام کو خراب کر لیتا ہے۔ ایک سچا صناع عوام کی ذرہ برابر پروا نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک عوام کا وجود ہی نہیں۔ اس کے پاس افیون یا شہد بھری روٹی نہیں جس سے وہ "دیو" کے لئے غذا مہیا کر سکے آجکل انگلستان میں ایک لاثانی ناول نویس مسٹر جارج میریڈتھ موجود ہیں۔ فرانس میں اس سے بہتر صناع ہیں لیکن وہاں ایسا کوئی نہیں جس کا نظریۂ حیات اس قدر وسیع، اتنا مختلف النوع اور تخیلی طور پر ایسا سچا ہو۔ روس میں ایسے داستان گو موجود ہیں جنھیں اس کا بہت کافی احساس ہے کہ افسانہ میں درد کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن افسانہ میں فلسفہ پیش کرنے کا فخر انہی کو حاصل ہے۔ ان کے کردار نہ صرف زندہ ہیں بلکہ خیالات بھی زندہ ہیں۔

لوگ اکثر پوچھتے ہیں کہ ایک صناع کے لئے کس طرز کی حکومت سب سے زیادہ مناسب ہے۔ اس سوال کا صرف ایک جواب ہے۔ صناع کے لئے سب سے زیادہ موزوں حکومت کسی حکومت کا نہ ہونا ہے۔

دنیا میں جابر تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو جسم پر ظلم کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو روح پر ظلم کرتا ہے۔ تیسرا وہ جو روح و جسم دونوں پر ظلم کرتا ہے۔ پہلے کو بادشاہ کہتے ہیں۔ دوسرے کو پوپ اور تیسرے کو عوام الناس۔ بادشاہ تربیت یافتہ ہو سکتا ہے لیکن خطرہ سے خالی کبھی نہ ہوگا۔ پوپ تربیت یافتہ ہو سکتا ہے لیکن بدطینتی سے کبھی پاک نہ ہوگا رہے عوام الناس سو ان کا

ذکر ہو ہی چکا ہے۔ عوام الناس کا تحکم ایک اندھی، بہری، کریہہ المنظر، دردناک، مضحکہ خیز، گمراہ کن چیز ہے۔ صناع کے لئے عوام کے ساتھ رہنا ناممکن ہے۔

یہ دکھایا جا چکا ہے کہ تحکم کے غیر معمولی دباؤ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ الفاظ کے سادے اور صحیح معنی توڑ مروڑ لئے گئے ہیں اور ان سے حقیقی معانی کے بالکل خلاف مراد لیا جاتا ہے۔ جو بات فن کے لئے ٹھیک ہے وہ زندگی کے لئے بھی ٹھیک ہے۔ اگر آج ایک آدمی اپنی خوشی کے مطابق کپڑا پہنے تو وہ بناوٹی کہلاتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں وہ بالکل فطری طریقہ پر عمل کرتا ہے۔ ایسے معاملات میں بناوٹ اپنے پڑوسیوں کی رائے کے مطابق کپڑا پہننے میں ہے، جن کی رائے اکثریت کی رائے ہونے کی وجہ سے نہایت مہمل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر آج کوئی شخص اس طریقہ پر ہے جو اسے اپنی شخصیت کے مکمل حصول کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے تو وہ خود غرض کہلاتا ہے۔ لیکن خود غرضی یہ نہیں ہے کہ آدمی جس طرح خود چاہتا ہے رہے، بلکہ یہ کہ جس طرح خود چاہتا ہے دوسروں کو اس طرح رہنے کو کہے۔ اور بے غرضی یہ ہے کہ دوسروں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور اس میں دخل نہ دیا جائے۔ خود غرضی ہمیشہ اس فکر میں رہتی ہے کہ اپنے چاروں طرف مطلق (Uniformity) یک رنگی پیدا کرلے۔ بے غرضی تنوع کو اچھی چیز سمجھتی ہے۔ خود سوچنا خود غرضی نہیں۔ وہ آدمی جو خود نہیں سوچتا سوچتا ہی نہیں۔ خود غرضی کی انتہا یہ ہے کہ اپنے ہمسایہ سے بھی یہ توقع کیجائے کہ وہ بھی اسی کی طرح سوچے اور اسی کی رائے اختیار کرے۔ لیکن کیوں؟ اگر وہ سوچ سکتا ہے تو غالباً دوسری طرح سوچے گا۔ اگر وہ نہیں سوچ سکتا تو یہ سخت بے ہودگی ہے کہ اس سے کسی خیال کی امید رکھی جائے۔ سُرخ گلاب اس لئے خود غرض نہیں کہ وہ سرخ گلاب ہونا چاہتا ہے۔ یہ انتہا درجہ کی خود غرضی ہوگی اگر وہ چاہے کہ تمام دوسرے پھول گلاب بھی ہوں اور سُرخ بھی۔ انفرادیت کے دور میں لوگ بالکل فطرت کے مطابق اور قطعی بے غرض ہوں گے۔ الفاظ کے مفہوم کو سمجھیں گے اور اپنی آزاد، خوبصورت زندگیوں میں انھیں حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ جب آدمی انفرادیت حاصل کرلے گا تو وہ دوسروں سے ہمدردی بھی کرے گا غم سے زیادہ مسرت میں۔ یونتو ہر طرح کی ہمدردی اچھی ہے لیکن غم سے ہمدردی سب سے کم اچھی ہے۔ یہ خود غرضی کا رنگ لئے ہوتی ہے۔ یہ مرض کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اس میں ایک خاصا حصہ اپنی سلامتی کے خطرہ کا بھی ہوتا ہے۔ ہمیں یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ہم خود جذامی یا اندھے ہو جائیں گے اور لوگ ہماری خبر لینا چھوڑ دیں گے۔ آدمی کو محض حیات سے ہمدردی ہونا چاہئے۔ نہ صرف زندگی کی جراحتوں اور مصیبتوں سے بلکہ زندگی کے لطف سے بھی۔ یہ وسیع تر ہمدردی یقیناً زیادہ دشوار ہے۔ اس کے لئے زیادہ بے غرضی کی ضرورت ہے۔ ہر شخص ایک دوست کی تکلیفوں سے ہمدردی کرسکتا ہے۔ لیکن ایک دوست کی کامیابی سے ہمدردی کرنے کے لئے بہت ہی بلند طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے۔

غم کے ساتھ ہمدردی ہمیشہ رہے گی۔ یہ انسان کے اولین احساسات میں سے ہے۔ وہ جاندار جو انفرادیت پسند ہیں یعنی اونچے درجے کے جاندار، اس امر میں ہمارے شریک ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مسرت سے ہمدردی غم کو کم نہیں کرتی۔ ممکن ہے یہ آدمی کو زیادہ مصیبت جھیلنے کے قابل بنا دے لیکن مصیبت پھر بھی باقی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ حقیقی غم بھی ایک ذریعہ ہے جس سے آدمی اپنی انفرادیت حاصل کرسکتا ہے دنیا کے لئے عجیب و غریب کشش رکھتی ہے۔ حالانکہ دنیا میں زیادہ تر غم ہی کی پرستش کی گئی ہے۔

بہر حال پچھلے زمانہ میں جو کچھ ہوا ہو لیکن موجودہ دنیا کے پاس انفرادیت پیدا کرنے کی متعدد تجاویز ہیں اس کی تجویز یہ ہے کہ جایداد اور اس کے مصائب کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس کی تجویز یہ ہے کہ غم اور اس کے مصائب سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اس کا نصب العین ایسا فرد ہے جو مسرت کے ذریعہ اپنا اظہار کر سکے۔ یہ انفرادیت اس سے زیادہ مکمل ہے۔ یہ محض وقتی احتجاج ہے۔ اس کا تعلق ظالمانہ، غیر صحت بخش اور غیر منصفانہ ماحول سے ہے آدمی جس چیز کی تلاش میں رہا ہے وہ درحقیقت نہ غم ہے نہ مسرت بلکہ صرف زندگی۔ آدمی پوری طرح مکمل طور پر اور انہماک کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہے، جب وہ بغیر دوسروں پر پابندیاں عاید کئے ایسا کر سکے گا تو وہ زیادہ سمجھدار، صحت بخش، مہذب اور "خود آپ" ہوگا۔ مسرت فطرت کی کسوٹی اور امن کی پسندیدگی کا نشان ہے۔ جب آدمی خوش ہوتا ہے تو وہ اپنے ماحول اور خود اپنے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ جدید انفرادیت جس کے لئے جدید اشتراکیت (خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے) کوشش کر رہی ہے مکمل ہم آہنگی ہوگی۔ یہ وہی ہے جس کی تلاش یونانیوں نے کی لیکن خیالی کے باہر مکمل طور پر حاصل نہ کر سکے۔ کیونکہ وہ غلام رکھتے اور ان کی پرورش کرتے تھے۔ یہ وہی ہے جس کی تلاش عیسویت کے نشاۃ الثانیہ نے کی لیکن مکمل طور پر حاصل نہ کر سکی۔ اب یہ مکمل ہو جائے گی اور اس کے واسطے سے ہر شخص اپنی تکمیل حاصل کرے گا۔ جدید انفرادیت جدید یونانیت ہے۔

(آسکر وائلڈ)

نظیر حیدر


نکسول

استعمال کرنے والے لوگ کبھی بوڑھے نہیں ہوتے

اس لئے کہ

نکسول تمام مضر صحت اجزا سے پاک ہے اس میں جو اجزا استعمال کئے گئے ہیں وہ نہایت قیمتی ہیں، ان کے زندگی بخش خصایص حکیموں اور ڈاکٹروں کے نزدیک مسلم ہیں، یہی وجہ ہے کہ نکسول کو بوڑھے بھی استعمال کر سکتے ہیں اور جوان بھی اور سب بقدر ظرف فایدہ اُٹھاتے ہیں، آپ بھی تجربہ کیجئے۔

قیمت

بڑی شیشی ---- آٹھ روپے

چھوٹی شیشی ---- تین روپے

نیشن اینڈ ایلس

اسپکٹ چیمبرس انکیس

فورٹ - بمبئی

# خانخاناں کی ہندی شاعری

ایک زمانہ تھا جب مسلمان فارسی، عربی کے ساتھ ساتھ ہندی اور سنسکرت کو بھی اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ اور ہندو فارسی میں شاعرانہ ملکہ حاصل کرتے تھے۔ رام نریش ترپاٹھی نے اپنی تصنیف کویتا کمدی میں اکیس مشہور مسلمان شعرا کے نام گنائے ہیں جن کو ہندی شاعری میں پوری مہارت حاصل تھی اور عبدالرحیم خانخاناں کا نام ان میں سب سے آگے ہے۔ اس سلسلہ میں چند مشہور ہندی شعرا کے نام یہ ہیں:

| | تصنیف | زمانہ |
|---|---|---|
| ۱۔ ملک محمد جائسی | پدماوت | ۱۵۵۷ |
| ۲۔ کتبن (قطبن) | مرگاوتی | ۱۵۵۸ بکرمی |
| ۳۔ منجھن | مدھومالتی | ۱۵۵۰-۱۵۹۵ |
| ۴۔ رحیم | | ۹۶۴ھ سے ۱۰۳۶ھ تک |
| ۵۔ عثمان | چترآولی | عہد جہانگیری |
| ۶۔ نور محمد | اندراوتی | ۱۸۰۱ بکرمی |
| ۷۔ داراشکوہ (ابن شاہجہاں) | | ۱۷۱۰ء |
| ۸۔ آصف خاں | | ۱۷۳۸ء |
| ۹۔ کریم | | ۱۷۵۴ء |
| ۱۰۔ محمد | | ۱۷۶۰ |
| ۱۱۔ عبدالجلیل بلگرامی | | ۱۷۶۵ |
| ۱۲۔ رحیم (یہ خانخاں نہ تھے) | | ۱۷۸۰ |
| ۱۳۔ عادل | | ۱۷۸۵ |
| ۱۴۔ اعظم خاں | | ۱۷۹۶ |
| ۱۵۔ طالب شاہ | | ۱۸۰۰ |

مسلمانوں میں ہندی کے رواج کی خاص وجہ یہ ہوئی کہ مسلمان بادشاہ، بھاشا اور ہندی شاعری سے کافی دلچسپی لیتے تھے چنانچہ اکبر خود ہندی میں شعر کہتا اور رائے تخلص کرتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے جہانگیر کو بھی ہندی سکھائی اور اپنے پوتے خسرو کو چھ برس کی عمر میں ہندی سیکھنے کے لئے ایک برہمن پنڈت کے سپرد کر دیا۔ شاہجہاں اپنی مادری زبان کے ساتھ ہندی زبان پر بھی قدرت رکھتا تھا اور اس کے دربار میں ہندو شعرا کا ایک منتخب گروہ رہتا تھا۔ اس کا بڑا لڑکا داراشکوہ نہ صرف ہندی کا شاعر بلکہ سنسکرت کا بڑا عالم تھا۔ اور اس نے "اُپنشدوں" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اورنگ زیب کو بھی ہندی سے اچھی طرح واقفیت تھی۔ ورنداس کے دربار کا مشہور ہندی شاعر تھا جسے ہندی زبان میں اخلاقی دوہے کہنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ الغرض بادشاہ سے لیکر ادنیٰ رعیت تک شعر و شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اور ان کی شاعری اصلی جذبات کی حامل ہوتی تھی۔ اس میں بناوٹ اور آورد بالکل نہیں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ عالم مشہور ہندی کے شاعر نے جو شاہزادہ معظم کا ملازم اور ہندو تھا ایک خاص اثر کی بنا پر اسلام قبول کیا۔ اس کا زمانہ ۱۶۰۳ء ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ایک معمولی مسلمان عورت تھی جس کے حسب ونسب کا کچھ پتہ نہیں۔ چونکہ یہ رنگریزی کا کام کرتی تھی اس لئے اس کو صرف رنگریزن ہی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ایک بار عالم کا عمامہ اس عورت کے پاس رنگنے کے لئے آیا۔ اس عمامے میں غلطی سے ایک پرچہ بھی چلا آیا جس پہ عالم کی ایک ناتمام نظم لکھی ہوئی تھی۔ اور اس کا یہ مصرع ادھورا تھا ؎ "کنک لتا سی نار ہے کٹ کا ہے سے تین"

اتفاق سے رنگریزن کی نظر اس پرچے پر پڑ گئی۔ اُس نے فوراً اسی پرچے پر نیچے یہ عبارت لکھدی اور شعر کو پورا کر دیا

"کٹ کا کنچن اینچ کے کچن مانھ بھر دین"

ان دونوں مصرعوں کا مطلب یہ ہوا: "وہ ایک سرو زرین ہے لیکن اس کی کمر کیوں اتنی پتلی ہے"۔ دوسرے مصرعہ میں اس کا جواب ہے کہ "کمر کا سونا نکال کر سینے میں بھر دیا گیا ہے اس لئے کمر اتنی باریک ہو گئی ہے"۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالم اس عورت پر نادیدہ عاشق ہو گیا اور اُس سے شادی کر لی۔

عالم ایک مشہور شاعر تھا۔ مصر بندھو دنود کے مصنف کہتے ہیں کہ اس کی شاعری فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے اس کو شنگار راس (عشقیہ شاعری) سے بہت لگاؤ تھا اس کی ایک کتاب کا نام عالم کیلی ہے۔

غرضکہ یہ ماحول تھا جس وقت رحیم نے جنم لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مسلمان شاعروں کے کہے ہوئے بہت سے بھجن اور گیت ہندوؤں کی عبادت میں داخل ہو گئے تھے اور آج تک ان کی پوجا میں شامل ہیں۔

علم و ادب آج کے زمانہ کے طرح نہ ہندو تھا نہ مسلمان کیونکہ انسان کا فعل ہمیشہ اس کے دلی تاثرات کا عکس ہوتا ہے اور جب دل صاف ہوں تو خیالات بھی پاکیزہ ہوتے ہیں اُس زمانہ میں رحیم نے ایسی ہی شاعری کی جو اعلےٰ خیالات سچی محبت اور بلندیٔ اخلاق کی آئینہ دار تھی۔ بھاشا در اصل پراکرت کی بہن اور سنسکرت کی بیٹی ہے اور اس کا گہرا رشتہ فارسی اور عربی سے بھی ہے۔

ہندی شاعری اپنے خدمات کے اظہار میں جواب نہیں رکھتی۔ اس میں سچی محبت، مشرقی حیا۔ مناظر قدرت کی مصوری فلسفہ حیات۔ اخلاق و حسن معاشرت یہ سب چیزیں خوب گھلی ملی ہیں۔ یہاں معشوق کے چہرے پہ رازداری کا نقاب نہیں ہوتا۔ سجنی اپنے سجن کے سامنے بہت بے باک ہوتی ہے مگر حیا کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔

اُردو میں میر اور حسرت میں ہاتھ کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ ہندی کے تقریباً ہر باکمال شاعر میں پائی جاتی ہے۔

رحیم کی شاعری پر بحث کرنے سے پہلے ان کے مختصر حالات زندگی پر روشنی ڈالنا بہتر ہوگا تاکہ ان کے ماحول تربیت و تعلیم۔ رجحان طبیعت۔ علمی خصوصیات وغیرہ کی بابت کوئی رائے قایم ہو سکے۔

نواب عبدالرحیم خانخاناں ۱۵۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ دوسرا قول ہے کہ ان کی پیدائش ۱۵۵۶ء میں ہوئی تیسرا قول ہے کہ ان کی پیدائش بتاریخ ۱۴ صفر ۹۶۴ھ بمقام لاہور ہوئی۔ قوم کے ترکمان تھے۔ ان کے باپ کا نام بیرم خاں تھا اور دادا سیف الدین علی خاں تھے۔ ۲۱ جلوس جہانگیری میں مطابق ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۶ء اس دُنیائے ناپایدار سے ۷۲ برس کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئے۔ (۱۵۵۳ء کی پیدائش صحیح معلوم ہوتی ہے) اور اپنی بیوی کے مقبرے میں جو حرم سرا کے پاس جانب جنوب اب تک گنجی گنبد کے نام سے مشہور ہے دفن کئے گئے۔

ہندوستان آنے سے پہلے ان کے خاندان نے فارس کے بادشاہوں کی خدمت کی۔ ان کے جدامجد کو شاہ اسمٰعیل طہماسپ نے ماوراالنہر کی لڑائی میں بابر بادشاہ کی کمک کو بھیجا جس میں انھوں نے بہت بڑا خطاب حاصل کیا۔ کہتے ہیں ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے قیام میں ان کے خاندان نے بڑی کوشش کی۔ خصوصاً ہمایوں اور اکبر کو انھیں کے خاندان کی بدولت سلطنت ملی۔ ان کے باپ بیرم خاں زبردست سپاہی اور مغلیہ خاندان کے بڑے سپہ سالاروں میں تھے۔ وہ اکبر کے اتالیق بھی تھے۔ انھوں نے بھی ہندی شعرانوازی میں بڑا حصہ لیا ہے چنانچہ ایک بار بابا رام داس کو ایک لاکھ روپیہ دیدئے۔ خود رحیم، اکبر کے دربار کے نورتنوں میں تھے اور اکبر ان کا بڑا لحاظ کرتا تھا۔

فارسی، عربی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی کے بھی عالم تھے اور ان زبانوں پر کماحقہ قابو رکھنے کی وجہ سے انھوں نے برج بھاشا کھڑی بولی اور پوربی بھاکا سب میں شاعری کی۔ رحیم اور رحمن تخلص کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی رحیما بھی۔ ہند محققین کی رائے میں ملک محمد جائسی مؤلف پدماوت ان کی ٹکر کے نہیں تھے ان کی مجلس ہمیشہ عالموں اور پنڈتوں سے بھری رہتی تھی۔ جب ان کے باپ بیرم خاں گجرات کی مہم میں شہید ہوئے تو ان کی عمر صرف چار برس کی تھی اکبر نے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور انھوں نے ایسی ترقی کی کہ آخر کار شہزادہ سلیم کے اتالیق ہوگئے خود شاعر بھی تھے اس لئے ایران کے باکمال شعراء ان کے دربار میں جمع ہونے لگے۔ انھوں نے شعراء کی اتنی قدر کی کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ ایک قصیدے کے صلے میں ملا حیاتی کو خزانہ میں لیجا کر کھڑا کر دیا اور کہا جس قدر اشرفیاں اٹھا سکو لیجاؤ۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ ایک دفعہ عرفی کو ایک قصیدے کے صلہ میں ستر ہزار روپیہ مرحمت فرمایا۔ ایک مرتبہ مشہور شاعر گنگ نے جس کی رحیم خانخاناں بہت عزت کرتے تھے ایک ہندی نظم ان کی تعریف میں پیش کی:

چکت بھنور رہ گیو گمن نہیں کرت کمل بن — ایہہ پھان مان نہیں لیت تیج نہیں بہت پون گمن
ہنس مانسر تجیو چک چکئی نہ ملے اَت — بہو سندری پدمنی پرش نہ چہیں نہ کریں رَت

رحیم اتنے خوش ہوئے کہ انھوں نے اسی وقت چھتیس لاکھ روپیہ کی ایک ہنڈی جو خزانہ میں جمع ہونے کو آئی تھی اٹھا کر کوی جی کو بخش دی۔ ان کی فیاضی اور سخاوت کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ ایک بار فیضی نے ان کی یہ فیاضی دیکھکر حسب ذیل قطعہ موزوں کیا:

خانخاناں عہد کانعامش — طبع را رخصت شگفتن داد
داست چوں اعتماد بر شعرا — صلہ پیش از مدیح گفتن داد

ان کا بالعموم دستور تھا کہ شعراء کی تنگدستی کی خبر سنکر بریانی اور مزعفر کی قابوں میں چاول کے نیچے روپیہ اور اشرفیاں بھر کر بھیجدیتے۔ ہندی شاعری کے علاوہ جس میں ان کی "ست سئی" کا رتبہ تلسی داس کی "رامائن" اور بہاری لال کی "ست سئی" کے برابر سمجھا جاتا ہے، انھوں نے تزک بابری اور گیتا کا ترجمہ فارسی میں کیا۔

رحیم سری کرشن جی کے بڑے معتقد تھے۔ ان کے متعلق جو شاعری انھوں نے کی ہے اس میں محبت کی بہت ہی لطیف جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی عادات و اطوار بہت ہی شایستہ اور شیریں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عمر بھر میں انھوں نے کبھی کسی پر غصہ نہیں کیا۔ سال میں ایک مقرر دن اپنے گھر کی ساری چیزیں خیرات کر دیا کرتے تھے۔ ان کو دنیا کے بہت

کافی گہرے تجربات حاصل تھے - اچھے اور بُرے دونوں طرح کے زمانے دیکھے تھے - اگر انتہائی عیش میں دن گزرے تھے تو مصیبت کی انتہائی منزلیں بھی طے کی تھیں - تلسی داس جی ان کے خاص دوستوں میں تھے - اگرچہ تارک الدنیا ہونے کے باعث تلسی داس جی ان کی فیاضی سے مستفید نہ ہوسکتے تھے لیکن جب کبھی انھوں نے کسی کی سفارش کی رحیم نے انتہائی ایثار سے کام لیا - ایک بار تلسی داس جی نے کسی مفلس برہمن کی سفارش نئے انداز سے کی - اس برہمن کی جوان لڑکی کنواری بیٹھی تھی اور غریبی کی وجہ سے بَر نہیں جُڑتا تھا - آپ نے برہمن کو ایک آدھا دوہا لکھکر دیا اور کہا کہ اسے خانخاناں کے پاس لیجاؤ نصف دوہا یہ تھا: "سُرتیہ - نرتیہ ناگیٹھ یہ چاہت سب کوے"

یعنے آسمان والے، دنیا والے، پاتال والے سب چاہتے ہیں کہ بیٹی کا بیاہ کریں -

رحیم خانخانان نے برہمن کی آرزو پوری کردی اور ساتھ ہی ساتھ تلسی داس جی کے پاس دوہا پورا کرکے بھیجدیا کہ:

گود لئے ہُلسی پھریں تلسی سائت ہوے

ہُلسی[1]، تلسی کو گود لئے پھر رہی ہیں (اور لوگ کہتے ہیں) بیٹا ہو تو ایسا ہو -

اکبر کے مرنے پر رحیم کو کچھ بُرے دن بھی دیکھنے پڑے کیونکہ جہانگیر نے اپنی کسی مصلحت کی بنا پر رحیم کو قید کردیا اور تمام مال و متاع ضبط کرلیا - رحیم کو جیل خانے کے اندر بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنا پڑیں - جب وہ وہاں سے چھوٹے تو چترکوٹ چلے گئے مگر لوگ پھر بھی پیچھے لگے رہتے تھے - آخرکار انھوں نے ایک بھکاری سے تو ایک بار صاف صاف کہدیا:

یہ رحیم دَر دَر پھریں مانگی مدھکری کھائیں  یارو یاری چھوڑ دو وے رحیم اب ناہیں

یعنے رحیم اب در در مارا پھرتا ہے اس لئے اب اس کا ساتھ چھوڑ دو کیونکہ پہلا سادہ رحیم اب نہ رہا - مگر وہ لوگ نہ مانے اور ان میں سے ایک نے خود اُن ہی کا یہ دوہا پڑھا:

رحمن دانی در در ہوے تو جانچے جوگ  جیوں سر تن سوکھا پرے کنواں کھداوت لوگ

یعنے اے رحمن جب سخی داتا کے دن خراب ہوں تو وہی اس کی جانچ کا صحیح وقت ہوتا ہے - جب ندیاں سوکھ جاتی ہیں تو لوگ کنویں کھدواتے ہیں -

انھوں نے عاجز ہوکر ایوان نرپش کے پاس یہ دوہا لکھ بھیجا:

چترکوٹ میں رم رہے رحمن اودھ نرپش  جا پر بپتا پرت ہیں سو آوت یہی دیش

اس دوہے پر خوش اور مگن ہوکر ایون نرپش نے ایک لاکھ روپیہ رحیم کے پاس بھیجدیا - رحیم نے سب روپیہ اس بھکاری کو دیدیا -

ان ہی دنوں میں مفلسی سے تنگ آکر رحیم نے ایک بھجوے (بھاڑ جھونکنے والے) کے یہاں بھاڑ جھونکنے کی نوکری کرلی تھی - چنانچہ ایک دن بھاڑ جھونک رہے تھے ایوان نرپش ادھر سے گزرے انھوں نے رحیم کو پہچان کر کہا:

جا کے سر اُس بھار سو کس جھونکت بھار اُس

---

[1] ہُلسی، تلسی داس جی کی ماں کا نام تھا -

یعنے جس کو دُنیا میں اتنی عزت حاصل تھی یا جس کی دنیا میں اتنی بڑی ذمہ داری تھی آج وہ کس طرح بھاڑ جھونک رہا ہے۔
ایوان نرپش کو یہ کہتے سُن کر رحیم نے فوراً جواب دیا ۔ "رحمن اُترے پار بھار جھونک سب بھاڑ"
یعنی رحیم اپنی ساری ذمہ داریاں بھاڑ میں جھونک کر کشتی عمر کو دریا کے پار لگا لائے۔
ان کی شاعری کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً وحدانیت (نغمہ توحید) مذہبیات۔ حسن اخلاق۔ تصوف و معرفت نفسیاتی جذبات۔ فلسفہ حیات۔ حسن و عشق و سراپا۔ جمالستان ضرب الامثال اور تجربے۔ متفرق دوہے۔
ان کی تصنیفات میں رحیم ست سئی۔ سنگار سورٹھ۔ برائے نائکہ بھید دوہا بہت مشہور ہیں۔
ان کے چند دوہے مختلف رنگ کے ملاحظہ ہوں :

مین کاٹ جل دھوئے کھائے ادھک پیاس — رحمن پیت سراہیئے، موے میت کی آس

مچھلی قتلے کرنے کے بعد پانی میں دھوئی جاتی ہے اور اس کے کھانے کے بعد پانی کی پیاس بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔
اے رحمن قابل تعریف محبت وہی ہے جو مرنے کے بعد بھی اتنی کشش رہے۔

رحمن دھاگا پریم کا جن توڑو جھٹکائے — ٹوٹے میں پھر نہ جُڑے جوڑے گانٹھ پڑ جائے

اے رحمن رشتۂ محبت کو جھٹکا دیکر توڑو نہیں کیونکہ یہ ٹوٹ کر جُڑنے کا نہیں اور جڑا بھی تو گانٹھ کا عیب پیدا ہو جائے گا۔

رحمن پانی راکھیو بن پانی سب سُون، — پانی گئے نہ اُوبھرے موتی، مانس، چون

(اے رحمن آبرو بڑی چیز ہے، جب یہ نہیں تو کچھ نہیں، پانی جانے سے موتی۔ انسان اور چونا تینوں بیکار ہوتے ہیں)

سرسو کھے پنچھی اُڑیں اور سرن سمائیں — دین ہین بن پکشی کہو رحیم کت جائیں

پانی سوکھتے ہی پرندے اُڑ کر دوسرے تالاب پر چلے جاتے ہیں۔ اے رحیم بتاؤ کہ غریب مچھلیاں کہاں جائیں جن میں اُڑنے کی طاقت نہیں ہے۔

امی پیاوے مان بن رحمن موہے نہ سُہائے — مان سہت مر بو بھلو برس دے بولائے

اے رحمن مجھے آب حیات پسند نہیں ہے جو بے عزتی سے دیا جائے وہ زہر بہتر ہے جو عزت کے ساتھ پیش کیا جائے

کھیر، کھون، کھانسی، کھُسی، بیر، پریت، مدھو پان — رحمن دابے نہ دبے جانت سکل جہان

خیرات، خون، کھانسی، خوشی، دشمنی محبت اور شراب کا استعمال پوشیدہ نہیں رہ سکتے سارا زمانہ جان لیتا ہے۔

کھیرا کی منھ کاٹ کے ملت نون لگائے — رحمن کڑوے مکھن کو چاہیئے یہی سزائے

کھیرے کے کڑوے پن کو دور کرنے کے لئے اس کا منھ کاٹ کر اس پر نمک ملا جاتا ہے اے رحمن بدزبان کو ایسی ہی سزا دینا چاہیئے۔

بگڑی بات بنے نہیں لاکھن کرو کن کوئے — رحمن بگڑے دودھ کو متھے نہ ماکھن ہوئے

بگڑی بات کو بنانا ایسا ہے جیسے پھٹے دودھ سے مکھن نکالنا۔

رحمن انگیا نیل کی رت میں پھٹی رتیک — مسنو کسوٹی ہیم پر دئی ہیم کی لیک

نیلے رنگ کی انگیا جو مسک گئی ہے اس میں سے کندن جیسا رنگ ایسا دمک رہا ہے جیسے کسی نے کسوٹی پر

سونے کی لکیر بنادی -

نین سلونے ہو ادھر، مدھ کہو رحیم گھٹ کون ؟ میٹھو چہے لون پئے میٹھے پر یہ لون

آنکھیں نمکین اور ہونٹ شیریں کون ادنےٰ درجہ کا ہے ؟ کوئی بھی نہیں۔ نمکین کے بعد شیریں اور شیریں پر نمکین چرچا ہے

جے سُلگے تے بُجھ گئے بجھے تے سُلگے ناہیں رحمن داہے پریم کے بُجھ بُجھ کے سُلگا ہیں

جو چیز سلگتی ہے وہ بُجھ جاتی ہے جو بُجھ جاتی ہے وہ سلگتی نہیں لیکن اہل محبت کا عجیب حال ہے کہ بُجھ بُجھ کے سلگتے ہیں

جیہہ رحیم تن من لیو ہر دے بیچ بھون ، تاسوں دکھ سکھ کہن کی رہی کتھا اب کون

اے رحیم جس نے تن من سب لے لیا جس نے دل پر قبضہ کر لیا اس سے اب دکھ سکھ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔

جو رحیم من بات ہے من سا کہوں کن جا ہیں جل ہیں جو چھایا پری کایا بھیجت ناہیں ،

اگر دل اپنے قبضہ میں ہے تو جہاں چاہئے جایئے کوئی ہرج نہیں جیسے پانی میں جسم کا عکس پڑتا ہے مگر جسم نہیں بھیگتا

انجن دیو تو کر کری سُرمہ دیو نہ جائے جن آنکھن سوں ہری لکھیوں رحمن بلی بلی جائے

انجن سے کرکری پیدا ہو جاتی ہے اور سرمہ لگایا نہیں جاتا جن آنکھوں میں ساجن سما جائے ان میں اور کا گزر مشکل ہے

ڈاکٹر صمدی


# سالہا سال کے تجربہ کا نتیجہ

**روحِ نشاط** : مقوی اعضائے رئیسہ ہے ریحی اور بلغمی امراض کو دور کرتی ہے اور چہرے پر شباب کی سُرخی جھلکنے لگتی ہے بچوں، بوڑھوں عورتوں سب کے لئے یکساں مفید ہے۔ قیمت فی شیشی تین روپے۔

**روحِ شفا** : ایک ایسی دوا جو اکیلی تمام امراض کا شافی علاج ہے۔ نزلہ، زکام، بخار، قے، دست، ہیضہ، متلی، مروڑ، پیچش، دردِ سر، دردِ نصف، دردِ شکم، داد، چنبل، خارش، پھوڑے پھنسیاں، بواسیری مسہ وغیرہ صعب امراض کا علاج ہے۔ قیمت فی شیشی دو اونس دو روپیہ آٹھ آنہ

**اکسیر مصفی** : یہ اکسیر خون کی خرابیوں کے لئے بے نظیر چیز ہے وہ لوگ جنھیں بہت پھوڑے پھنسیاں نکلتے ہوں انکے لئے یہ اکسیر لاجواب تحفہ ہے۔ قیمت فی شیشی ۳۰ قرص ۳ے ر۔ بوتل عرق منڈی ۲ے ر

**قرص ملین** : یہ دوا رفع قبض کے لئے لاجواب ہے اس سے پیچش، مروڑ بکھ عرصہ استعمال کے بعد دائمی قبض بھی رفع ہو جاتا ہے۔ قیمت فی بکس ۲۵ قرص ۱ے ر

**قرص عرق** : دردِ سر، نزلہ، زکام اور بخار کے لئے تیر بہدف دوا ہے۔ اس سے پسینہ آکر پندرہ منٹ میں بخار اُتر جاتا ہے۔ دردِ سر کو پانچ منٹ میں دور کرتی ہے۔ قیمت فی بکس ۲۵ قرص ۱ے ر

**سُرمہ نورانی** : یہ سرمہ جملہ امراض چشم، دھند، جالا، خارش، پربال، گوہانجنی، ناخونہ، آشوب چشم وغیرہ کے لئے بغایت مفید ہے

قیمت فی شیشی ۱ے ر

**موتی منجن** : یہ منجن دانتوں کی جڑوں کو مضبوط کرتا ہے۔ خون نکلنا مسوڑھے سے بدبو آنا۔ دانتوں کا ہلنا بند ہو جاتا ہے۔ قیمت فی شیشی ۸ر

نوٹ : چونکہ پارسل کا محصول اور پیکنگ وغیرہ کی رقم کافی ہو جاتی ہے۔ اس لئے صرف ایک دو بکس منگانے میں آپ کا نقصان ہوگا۔

ملنے کا پتہ : فردوسی دواخانہ۔ نفیس منزل۔ لکھنؤ

# حکومت کی اقتصادی وصنعتی پالیسی

## اور

# پاکستان معاشی مستقبل

(بہ سلسلۂ ماسبق)

## ہندوستان کے وسایل

ہندوستان کے جغرافی وقوع نے اس ملک کو ساری دنیا کے ممالک سے کچھ اس طرح الگ کر رکھا ہے کہ اکثر اعتبار سے اس کی حیثیت ایک براعظم کی ہوگئی ہے۔ طبعی ماحول، آب وہوا کے تنوع، قدرتی وسایل کی گوناگونی، محنت کی فراوانی اور زمینوں کے کیمیاوی خواص نے زرعی ومعدنی دونوں طرح ہندوستان کو ایسا زرخیز خطہ بنا دیا ہے کہ اس حیثیت سے امریکہ اور روس کے سوا دنیا کا کوئی ملک اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

یہاں (تقاسمہ ئ) کے علاوہ آج تمام ممالک سے زیادہ شکر، تمباکو اور روغنی تخم پیدا ہوتا ہے، کپاس کی پیداوار میں امریکہ کے بعد اسی کا نمبر ہے، دنیا میں $\frac{3}{4}$ حصہ دھان یہیں پیدا ہوتا ہے، ربڑ کی پیداوار بھی یہاں بہت زیادہ ہوتی ہے اور معدنی پیداوار کے لحاظ سے بھی ہندوستان کا خاص مرتبہ ہے۔ چوپائے اور مویشی جو زراعت کیلئے بڑے کارآمد ہوتے ہیں، ہندوستان میں ان کا تناسب تمام دنیا کی تعداد کا ایک تہائی ہے۔

لیکن تعجب ہے کہ ان ساری خصوصیات کے باوجود ہندوستان جسے لارڈ کلایو لازوال دولت سے تعبیر کرتا تھا آج اقتصادی حیثیت سے اس کا شمار دنیا کے پست ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ جس ملک سے دولت کا دریا بہہ کر دوسرے ممالک میں صدیوں سے پہونچ رہا ہے، آج خود وہاں کے باشندے قحط وخشک سالی کے شکار ہو رہے ہیں اور ان کی معاشی ونفسیاتی پر ان کے افلاس کا نہایت خراب اثر پڑ رہا ہے۔ اور اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اپنی حالت سدھار سکے۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ ہم مفلس کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟ ہم اپنی دولت سے بہرہ ور کیوں نہیں ہوسکتے؟۔

ہمارے افلاس کے اسباب یہ بتائے جاتے ہیں کہ ہندوستان کی تہتر فیصدی آبادی پیشہ زراعت ہے اور صرف زراعت پیشہ لوگوں ہی کے نکبت وافلاس کو سارے ہندوستان کے فقر وفاقہ کا سبب بتایا جاتا ہے اور ہمیں سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ صرف زراعت کی ترقی، کاشتکاروں کی مالی اصلاح اور زرعی قرضوں کی ادائی سے ہمارا ملک خوشحال بن جائے گا۔

اکثر مغربی مورخین و معاشیین کا خیال ہے کہ ہندوستان کی اوہام پرستی اور مذہبی جنون بھی بڑی حد تک اُس کے افلاس کا باعث ہیں۔ مسٹر فنڈلے شراز پروفیسر اقتصادیات و پرنسپل گجرات کالج احمد آباد اپنے مختصر رسالہ "افلاس ہند" میں تحریر فرماتے ہیں کہ ہندوستان کا قحط و افلاس کوئی نئی چیز نہیں، خود چنک (یا کوٹلیا) وزیر چندر گپت مؤرجہ یا "کوریہ" کے زمانہ سے ہندوستان کے حکمرانوں کا رعایا کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہ رہا وہ کہتے ہیں کہ چنک کی کتاب ارتھ شاستر کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی اس وقت کے معاشی قوانین کی شدت و کثرت کو دیکھ کر حیران رہ جائے گا۔ پرنسپل شراز اس بات کے بھی مدعی ہیں کہ حکومت برطانیہ ہی کے قدم کے یہ برکات ہیں کہ ہندوستان کی معاشی حالات پہلے سے اب بدرجہا بہتر ہوگئی ہے مگر قدرتی طور پر دولت کی غیر مساوی تقسیم اور ناکافی پیدائش کے سبب اس کی پوزیشن، زراعتی اعتبار سے درجۂ دوم کے ممالک (مثلاً بلغاریا، یونان، اور شمالی اطالیہ وغیرہا جیسی ہے جن کے حالات ہندوستان سے ملتے جلتے ہیں۔ انگلستان جیسے ترقی یافتہ ممالک سے اس کا مقابلہ کرنا ان کے خیال میں غلطی ہے۔

## ہندوستان میں قحط اور مسٹر شراز کے بیان کی حقیقت

چنک کی ارتھ شاستر سے اس قدر ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ خشک سالی یا کثرت بارش کے سبب اس زمانہ میں بھی ملک میں قحط نمودار ہو جایا کرتا تھا لیکن اس کے روک تھام کی بھی فوری کوششیں کیجاتی تھیں جیسا کہ خود مسٹر شرار کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

مسلمان بادشاہوں کے دور میں ہندوستان میں چار مرتبہ یہ بلا نازل ہوئی ۱۳۴۳ء میں محمد تغلق کے زمانہ میں ہندوستان کے شمالی حصہ میں سخت قحط پڑا، لیکن بادشاہ نے فوری امداد کا انتظام کیا اور ملک کے باشندوں کو چھ مہینہ کی خوراک تقسیم کردی گئی۔ پھر اکبر اور شاہجہاں کے وقت میں قحط نمودار ہوا اور امداد کا معقول انتظام کیا گیا، چوتھی مرتبہ یہ بلا اورنگ زیب کے وقت میں نازل ہوئی اس نے جو امدادی انتظام کیا اس کی ضمن میں مِل[2]، اورنگزیب کی تحسین کرتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے کہ بایں ہمہ اگر لوگ اورنگزیب کو رحمدل اور ہمدرد نہیں تسلیم کرتے ہیں تو کم از کم اتنا تو ضرور ماننا پڑے گا کہ وہ بڑا پیش بین، بیدار مغز اور دور اندیش تھا یہ اس کی مال اندیشی سمجھنی چاہئے کہ اس نے ایسے وقت حد درجہ کی فیاضی اور دریا دلی سے کام لیکر مالگزاری اور محصول یک قلم معاف کردیا، سرکاری خزانہ سے بغیر کسی حد و حساب کے داد و دہش شروع ہوگئی جہاں غلہ دستیاب ہوتا تھا وہاں سے قحط زدہ مقامات میں پہونچا کر ارزاں فروخت کرنے کا انتظام کیا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں پہلی مرتبہ ۱۷۶۹ء میں قحط کے خطرات نظر آئے مگر کمپنی نے کوئی حفاظتی کارروائی نہ کی اور بنگال کی تہائی آبادی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد بھی متعدد بار یہ بلا یہاں نازل ہوئی لیکن کمپنی نے کوئی انتظام نہ کیا۔ تاج برطانیہ کے ماتحت ہندوستان کی حکومت آجانے کے بعد بھی بارہا قحط پڑا اور لاکھوں آدمی ضایع ہوئے۔

قحط کے اسباب عموماً قدرتی ہوتے ہیں لیکن بیدار مغز اور دردمند حکومت ہمیشہ خطرات کے سد باب کی امکانی کوششیں

---

[1] Mr. Findlay Shirras — [2] James Mill

کرتی ہے۔ گزشتہ سال بنگال کے قحط کے خطرات کا علم ہر ادنیٰ شخص کو ہو چکا تھا مگر حکومت نے پہلے سے روک تھام کی کوئی کوشش نہ کی جس سلسلہ میں سر جوالا پرشاد سریواستو غلطی کا اعتراف بھی کر چکے ہیں اور اسوقت بھی حکومت جو تدابیر کر رہی ہے اس میں اعتراض کی کافی گنجائش ہے۔

ملک کی سوشلسٹ جماعت صرف زمینداروں کے وجود کو ملک اور ملک کے کاشتکاروں کی غربت کا سبب بتاتی ہے ان لوگوں کا خیال ہے کہ زمینداروں کا نام و نشان مٹ جانے ہی سے کاشتکاروں کے مصائب دور ہو جائیں گے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن مقامات میں زمینداری کا طریقہ رائج نہیں ہے مثلاً مدراس، بمبئی، مغربی یوپی، پنجاب یا جن جگہوں میں رعیتواری یا محالواری طریقہ قایم ہے وہاں کے لوگ کیوں مفلس ہیں؟ - اس کے علاوہ سوال یہ ہوتا ہے کہ بعض صوبوں میں زمینداروں کی حالت کاشتکاروں سے زیادہ نازک کیوں ہو رہی ہے؟

مسٹر رمیش چندر دت کا عقیدہ ہے کہ لگان کی زیادتی ہماری تباہی کا باعث ہے وہ دوامی بندوبست کے حامی تھے۔ ۱۹۰۱ء کے قحط کے دوران میں جب انھوں نے مشرقی بنگال کا سرکاری دورہ کیا تھا تو وہاں کے کاشتکاروں پر عالمگیر قحط کا اثر نہ پایا تھا اس کی وجہ وہ دوامی بندوبست اور مختصر لگان آراضی کو بتاتے ہیں چنانچہ انھوں نے حکومت سے سفارش کی کہ یہی طریق بندوبست ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی جاری کر دیا جائے۔ مسٹر دت کے خیال سے کہاں تک اتفاق کیا جا سکتا ہے اس کے فیصلہ کے لئے طریق بندوبست مالگذاری اور حقیقت آراضی کی مختلف قسموں پر اجمالی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

## بندوبست مالگذاری

ہندوستان میں بندوبست آراضی کے تین طریق رائج ہیں زمینداری، محال واری اور رعیتواری، اول الذکر کا بندوبست زمیندار سے کیا جاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں دوامی اور میعادی۔ بنگال، بہار، بنارس اور شمالی مدراس میں دوامی بندوبست رائج ہے اور میعادی کا رواج اودھ میں ہے جہاں تعلقہ داروں کے ساتھ آراضی بندوبست کی جاتی ہے۔ محالواری طریق کے مطابق بندوبست ٹھیکہ داروں سے کیا جاتا ہے۔ اس کا رواج آگرہ، اودھ، صوبہ متوسط، پنجاب اور شمالی بہار کے بعض اضلاع میں ہے۔ رعیتواری بندوبست کاشتکار سے براہ راست کیا جاتا ہے اور یہ طریق آسام، بمبئی اور مدراس میں جاری ہے ان کے علاوہ بنگال اور بہار کے بعض علاقوں میں ذیلی ملکیتیں مثلاً پتنی داری ( Patnidari ) درپتنی داری اور عارضی یا مستقل ذیلی کاشتکاریاں بھی ہوتی ہیں۔

## طریق بندوبست کے نقائص

موجودہ طریق بندوبست کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سارے ملک میں یکساں طریقہ بندوبست نہیں ہے اور سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ شرح مالگذاری بہت زیادہ ہے۔ تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ منوسمرتی (ضوابط منو Laws of Manu) کے مطابق حکومت ابتدائی زمانہ میں ملک کا چھٹا حصہ جنس کی شکل میں ہر سال وصول کر لیا کرتی تھی مگر رفتہ رفتہ بعض قباحتوں کے سبب زر کی شکل میں وصول ہونے لگی۔ شیر شاہ نے سب سے پہلے بندوبست لگان میں اصلاح کی، علاء الدین خلجی اور عہد تیموری کی مثالیں بھی اس کے سامنے موجود تھیں، جس سے اس کو بڑی مدد ملی۔ اکبر کے زمانہ میں ٹوڈرمل نے مزید ترمیم کی کوشش کی

لیکن شرح مالگذاری بڑھا کر پیداوار کی ایک تہائی کردی گئی۔ فرخ سیر کے وقت سے مستاجری مالگذاری (Revenue Farming) کا طریق عمل میں لایا گیا، تحصیلدار مالگذاری کا دسواں حصہ پانے لگا اور رفتہ رفتہ یہ چیز موروثی بن گئی۔ کمپنی کی حکومت کے ابتدائی دور میں جس وقت اس کے علاقے اور مقبوضات محدود تھے، تحصیل وصول کے سارے اختیارات رضاخاں کو دیدئے گئے تھے، اس کے معطل ہوجانے کے بعد دیہاتی قانون گو مختلف علاقوں میں مقرر کئے گئے، تیسرے دور میں تحصیل کرنے والی ایجنسیاں قایم کی گئیں، پھر دیہاتی عوامل کا تقرر ہوا ۱۸۷۶ء صوبہ کی تقسیم ضلعوں میں کی گئی اور ہر ضلع کا ایک تحصیلدار ( ) مقرر ہوا۔ اسی سال لارڈ کارنوالس ہندوستان پہونچے اور دوامی بندوبست کی اسکیم اپنے ساتھ لائے سرجان شور نے اس کی زبردست مخالفت کی مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، دوامی بندوبست کی حمایت میں کہا گیا کہ طویل کی بندوبست میں کاشتکاری کو فروغ دینے کا کافی موقع ملیگا۔ بنگال کے بعض اضلاع میں شرح لگان بڑھا کر اکبر کے عہد سے دوچند یعنی سال کی پیداوار کی دو تہائی کردی گئی اور بڑی مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ سرکار نے اگرچہ زمیندار کو خوش کرنے کے لئے آراضی کا اصل مالک قرار دیدیا مگر لگان کا $\frac{10}{11}$ حصہ تو عالیہ کی شکل میں خود وصول کرنے لگی اور زمیندار کو صرف $\frac{1}{11}$ حصہ بطور معاوضہ دیدیتی۔

## آراضی کا اصل مالک کون ہے

زمین کا مالک کون ہے سرکار، زمیندار یا کاشتکار۔ یہ سب اختلافی مسئلہ ہے اول اول سرجان شور اور مسٹر گرانٹ کے درمیان اس قسم کی بحث چھڑی تھی، سرجان شور زمین کا حق ملکیت زمیندار کو دیتے تھے اور مسٹر گرانٹ اس کا مالک سرکار کو بتاتے، ہرچند حکومت اس حق کا دعویٰ نہیں کرتی ہے مگر عملاً وہ ہر طرح سے اُمور متعلق آراضی پر پورا اختیار رکھتی ہے اور عملاً حکومت نے کاشتکار یا زمیندار کو مالک زمین تسلیم نہ کیا۔

## ہندوستان کے افلاس کا سبب دیہی قرضہ نہیں ہے

مجھے اس خیال سے ہرگز اتفاق نہیں ہوسکتا کہ ہندوستان کے فقر و فاقہ کا سبب دیہی قرضہ اور کاشتکاروں کا افلاس ہے، محض کاشتکاروں کی مشکلات دور کردینے سے رعایا خوش حال نہیں ہوسکتی ہے کسانوں کو صرف زمینداروں اور مہاجنوں سے تعلقات کا تجربہ ہے وہ صرف ان کے وجود کو اپنی ساری مصیبتوں کا سبب سمجھتے ہیں یہ صحیح ہے کہ بڑے بڑے مہاجن غریب کاشتکاروں کا خون چوس کر موٹے بن گئے ہیں اور بہت سے زمینداروں کی شان و شوکت کاشتکاروں اور رعایا کے دم کی رہین ہے مگر ہماری نگاہیں محدود ہیں اور ہم دور تک نہیں دیکھ سکتے ہیں اس لئے ہم صرف انھیں کے وجود کو مستقل عذاب سمجھتے ہیں لیکن ہم ملک کی تباہی اور قوم کے افلاس کے اصلی اسباب سے واقف ہونے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ ہماری اس گمراہی کے ذمہ دار ہندوستان کے نام نہاد اشتراکی ہیں جو اپنی جماعت کے مسلک اور تقدیس کی بے حرمتی کر رہے ہیں یہ لوگ (نامراد جویائے معاش ہیں) جن کا کام لوٹ مار کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

گزشتہ گرمی کی چھٹیوں میں مجھے یوپی اور بہار کے ایسے دیہاتوں کا دورہ کرنے کا موقع ملا ہے جہاں دوامی بندوبست کا طریق رائج ہے وہاں بعض آراضیات کے لگان میں پیداوار کا نصف حصہ زمیندار کو دیدیا جاتا ہے،

اس طریق کو بٹائی بندوبست کہتے ہیں لیکن بیشتر زمینوں کے لگان کی وصولی دوامی پٹہ اور شرح معین کے مطابق ہوتی ہے ایسے کھیت نقدی کہلاتے ہیں۔ مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ جن زمینداروں کے پاس خود کاشت زمینیں ہیں وہ ہمیشہ آسودہ رہتے ہیں، لیکن جو زمیندار ایسا نہیں کرتے وہ صرف مقررہ لگان کے مستحق ہوتے ہیں اور ان کی بسر مشکل سے ہوتی ہے۔ البتہ صرف بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی حالت بہت اچھی ہے یہ لوگ مہاجنی بھی کرتے ہیں اس کی مثالیں بنگال، جنوبی بہار اور اوڑیسہ میں خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔

## افلاس کے اصلی اسباب

ہمارے افلاس کے دو اسباب ہیں، انگلستان میں صنعتی انقلاب کی جد و جہد کرنے والے عناصر کا ظہور اور ہندوستان کی موجودہ طرز حکومت، اکثر لوگ صرف صنعتی انقلاب کو وجہ ہلاکت سمجھتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ انگلستان میں ایجاد و انقلاب کی کوششیں تو پہلے بھی ہوتی رہی ہیں لیکن اس میں کامیابی کے لئے دولت اور سرمایہ کی ضرورت تھی اس لئے اسوقت تک انقلاب ممکن نہ ہو سکا جب تک یہاں کی دولت انگلستان نہ پہونچنے لگی۔ انگلستان پہلے صرف زرعی ملک تھا اور ہندوستان میں زراعت و صنعت دونوں تھے۔ انگلستان میں صنعتی انقلاب کے بعد زراعت رفتہ رفتہ ختم ہونے لگی اور صرف مشینوں کے ذریعہ وہاں کی صنعت کو فروغ دینے کی کوشش ہونے لگی چنانچہ طرز حکومت ایسی اختیار کی گئی کہ ہندوستان زیادہ سے زیادہ زراعت کی طرف رجوع ہونے لگا اور خورد و نوش کے سامان کے علاوہ ان کی صنعت کے لئے زیادہ سے زیادہ خام پیداوار مہیا کرنے لگا، اسی مقصد کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کے وقت سے کوشش جاری تھی اور پھر تاج برطانیہ کے ماتحت حکومت ہند نے ایسی پالیسی اختیار کی کہ ہمارے یہاں کی دولت آہستہ آہستہ باہر جانے لگی اور ہم کو اسکا احساس نہ ہوا۔

(باقی)

حسرت نعمانی ام۔اے


## فلسفۂ مذہب

جس میں روایتی مذہب اسلام کی حقیقت کو ظاہر کرکے بتایا گیا ہے کہ اصل اسلام کیا ہے اور دنیا اب جس چیز کو اسلام سمجھ رہی ہے وہ اصل سے کتنا مختلف ہے۔ اس کتاب کا تعلق نگار کے اس دور سے ہے جب اڈیٹر نگار کو اول اول کافر و ملحد قرار دیا گیا اور سارے ہندوستان میں ہل چل مچ گئی

مصنفہ سید مقبول حسین بی اے

قیمت علاوہ محصول عہ۔ نگار بک ایجنسی لکھنؤ

## تذکرۂ معرکۂ سخن

اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ جس میں تمام قدیم و جدید شعراء فارسی و اردو کے کلام پر اعتراضات اور ان کے جوابات کو یکجا کر دیا گیا ہے اسی کے ساتھ محاکمہ بھی کیا گیا ہے جو اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے بہا چیز ہے۔ مرتبہ آسی۔

قیمت علاوہ محصول تین روپے

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

# پھول یا انگارے؟

ہر نیا خیال اپنے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ ضرور لاتا ہے لیکن "سیڈزم" (Sadism) کا خیال اپنے ساتھ ایک پوری شخصیت لایا ہے اور یہ ہے مارکوئیس ڈی سیڈے کی شخصیت ؟ سیڈزم کیا ہے ؟۔ فلسفیوں اور ماہرین نفسیات نے اس کے مختلف تعریفیں کی ہیں۔ سیڈزم اس ذہنی رجحان کا نام ہے جس کا مریض ظلم وستم کا شوق رکھتا ہے اور دوسروں کو تکلیفیں پہونچا کر اس شوق کو پورا کیا کرتا ہے اس قسم کے رجحانات رکھنے والے ظلم وستم کے واقعات سے خواہ وہ تخیلی ہوں یا عملی نہ صرف حظ حاصل کرتے ہیں بلکہ ان کے لئے جنسی آسودگی حاصل کرنے اور دلجمعی پانے کا پہلا اور آخری ذریعہ یہی حادثات ہوتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی بے راہ روی سہی لیکن انسان میں اس قسم کے رجحانات کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا اس کی مثالیں ہماری روزانہ زندگی میں کثرت سے ملتی ہیں ہوسکتا ہے کہ ہم اس جذبے کا رشتہ اسوقت سے ملانے میں کامیاب ہوجائیں جب انسان حیوانوں کی سی زندگی بسر کیا کرتے تھے غاروں میں رہتے اور پھل پھول پر زندگی گزارتے تھے طاقت ان کا قانون تھا اور انسانی خون اتنی اہمیت نہ رکھتا تھا جتنی آجکل کی مہذب دنیا میں اسے حاصل ہے اور اسی لئے ان رجحانات کا پتہ ہمیں ان کہانیوں میں بھی ملتا ہے جو بچپن میں ہمارے لئے تفریح کا سامان فراہم کیا کرتی تھیں، مثلاً "الف لیلہ" کا وہ بادشاہ جو ہر رات ایک نئی لڑکی کو اپنے محل میں لاتا اور ہر صبح کو اسے قتل کردیا کرتا تھا۔

یورپ میں اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں، جرمنی کی ایک مشہور رقاصہ اپنی سوانح حیات میں ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے جو اس کے پاس جنسی آسودگی حاصل کرنے جایا کرتے تھے ۔ "بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے ساتھ کبوتروں کا ایک حسین جوڑا لاتے ہیں اور انھیں اس وقت تک جنسی آسودگی حاصل نہیں ہوتی جب تک میں اور وہ دونوں بالکل برہنہ ہوکر اپنے ہاتھ سے ان کبوتروں کی گردنیں مروڑ مروڑ کر ان کا سارا خون قطرہ قطرہ کرکے نہ نچوڑ لیں" یہ یورپ کی ایک رقاصہ کی آپ بیتی ہے اور اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یورپ میں یہ ذہنی بے راہ روی کس قدر نمایاں ہے فرانس میں ویجر دی ریپر کا قصہ نہایت مشہور ہے جس نے ہزاروں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ جب ۳۱ اگست ۱۸۹۵ء کو ایک چرواہے کو مارنے اور اس کی لاش کے اعضاء مخصوصہ نکال لینے کے جرم میں اسے گرفتار کیا گیا تو اس نے عدالت کے سامنے نہایت ہی ہیبت ناک جرموں کا اقرار کیا، نوجوانی میں اپنی اس معشوقہ کو قتل کرنے کے بعد (جس نے اس سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا) قتل وغارت گری کے واقعات کو اپنا معمول بنالیا وہ خودکشی کرنا چاہتا تھا مگر پاگل خانے بھیج دیا گیا یکم اپریل ۱۸۹۴ء کو چھوٹا، اس کے بعد ہی ایک اکیس سالہ دوشیزہ کا گلا کاٹ کر اس کی لاش کو زدوکوب کیا، تیرہ سے سترہ سال کی متعدد لڑکیوں کے نرخرے چبا ڈالے، گلے کاٹنے اور لاش سے حظ حاصل کرنے کے واقعات اس کی

زندگی میں کافی سے زیادہ ہیں۔ چند مہینے بعد ایک پچاس سالہ بڑھیا کو مجروح کر کے اس سے شہوانی آسودگی حاصل کی، ۲۲ راگست کو ایک سترہ سالہ لڑکی کا نرخرہ چبا گیا اور اس سے جنسی آسودگی حاصل کی اور آخر میں اس کے اعضاء مخصوصہ کاٹ کر لے گیا، یکم مارچ ۴۶ء کو ایک گیارہ سالہ لڑکی کو خراب کرنے کی ناکام کوشش کی، ایک لڑکے کو قتل کر کے اس کی لاش کنویں میں پھینک دی ـــــ اور بالآخر پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا!

یوں تو یہ رجحان تھوڑا بہت سب انسانوں میں ملتا ہے لیکن ان چھوٹی موٹی باتوں سے کوئی نفسیاتی قسم ظہور پذیر نہیں ہوتی اور ان کی وجہ سے ہم ہر ایک انسان کو سیڈسٹ نہیں کہہ سکتے۔ بچوں کو اس قدر گدگدانا کہ وہ رو پڑیں قتل و خون کے واقعات سے ہماری دلچسپی اور اس قسم کی اور بہت سی چیزیں اس کی گواہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سیڈزم کی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جس کی تعریف ایوان بلاک نے سیڈے کی تصانیف کے دیباچے میں اس طرح کی ہے:

"ـــــ یہ جذبہ جنسی آسودگی کے خوفناک چونکا دینے والے حادثات اور تخریبی واقعات سے وابستہ ہو جانے کا دوسرا نام ہے خواہ یہ دل بستگی شعوری طور سے پیدا کی گئی ہو یا غیر شعوری طور سے؟ اس قسم کے مریض ایسے حادثات سے حظ حاصل کرتے ہیں جو کسی انسان یا حیوان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہوں خواہ ان حادثات کا تعلق خود مریض کی ذات سے ہو یا کسی اور ذات سے ـــــ"

کسی نے کہا ہے کسی بحث کو شروع کرنے کا موزوں ترین طریقہ یہ ہے کہ اسے تعریف و ماہیت سے شروع کیا جائے۔ لیکن سیڈزم کی تعریفیں لکھنے کے معنے یہ ہوں گے کہ ساری بحث ایک ایسا معمہ بن جائے جو سمجھنے کا رہے نہ سمجھانے کا۔ یوں تو مول (Moll) فیرے (Fere) اور کریفٹ ربنگ (Kraffft Ebbing) ہولاک ایلس (Havelock Ellis) اور سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) وغیرہ ماہرین نفسیات نے اس رجحان کی مختلف تعریفیں کی ہیں لیکن سیڈزم کے سمجھنے کے لئے تعریفوں سے کہیں زیادہ مفید خود اس شخص کا مطالعہ ہے جس نے سیڈزم کے خیال کو نفسیاتی حقیقت میں تبدیل کیا۔

ڈی سیڈے کی زندگی کے نشیب و فراز، بے راہ روی، ذہنی رجحانات، خون کی پیاس۔ سبھی کچھ ایک حسین مگر ہیبتناک سلسلہ ہے شام کی خونیں شفق کے پس منظر میں ایک ایسی قوس قزح کا جو ایک ہیبت ناک خونیں غار سے نکلتی اور اسی قسم کے دوسرے مہیب غار میں ڈوبتی نظر آتی ہے غم عشق، غم روزگار، غم دنیا اور کچھ حد تک غم عقبیٰ ـــــ اور ان سب مصائب سے بڑھ کر اس کا اپنا احساس یہ ساری چیزیں جمع ہو کر اس کے نفسیاتی زوال، تخریب اور غلط روی کی ذمہ دار ہیں ان غم و آلام نے جہاں سیڈے کی ذات میں آرٹسٹ کو پیدا کیا وہاں اس کے تخریبی رجحانات کو بھی جنم دیا جو زندگی بھر شام کی مہیب پرچھائیوں کی طرح اس پر چھائے رہے۔ سیڈے عالی دماغ مصنف، زبردست عالم، اور ایک قابل قدر آرٹسٹ ہوتے ہوئے سیڈے ہو سکتا ہے بے راہ روی کا امام سیڈے! اور یہ زیادہ حیرتناک بات نہیں معلوم ہوتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی زندگی ناکامی و نامرادی، درد و الم اور احساس تنہائی سے مسلسل جنگ کرتے گزری تھی۔

سیڈے کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ ۱۷۴۰ء میں میرس کے ایک مالدار گھرانے میں پیدا ہوا جہاں زندگی نار تھا صوفوں پر کھیلنے کودنے اور ریشم کے پردوں کے پیچھے آرام دہ ڈرائنگ روم میں دوڑتے پھرنے کا، اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، لاڈ پیار میں پلا علم و فن دل لگا کر سیکھے۔ علم و ادب کے علاوہ فن حرب کی بھی تعلیم حاصل کی، اس زمانے کے یورپ میں

بڑے گھرانے والوں کے لئے جتنے ہنر ضروری تھے سب سیکھے اور ان سب پر اچھی طرح قدرت حاصل کرلی، افسوس ہے سیڈے کی کوئی تصویر آج دستیاب نہیں ہوسکتی ورنہ ممکن تھا کہ اس کی اس غم نصیب زندگی ۔ بورژوا ماحول میں پرورش پانے کے اثرات، پھر تنہائی، عقیدخانے اور پاگل خانے کی زندگی کے نقوش ۔ اس کے چہرے پر مل سکتے، اس کا ایک سوانح نگار (Arthur Symons) لکھتا ہے : ۔" اس کا چہرہ زرد اور مٹیالے رنگ کا تھا اور اس کی دو بڑی اور کالی آنکھوں سے (جنھیں کچھ سوانح نگار بھوری بتاتے ہیں) وحشت برستی تھی ۔ وہی وحشت جس نے اس کی ساری زندگی تباہ کردوں، دوسرے سوانح نگاروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی آواز نہایت شیریں اور دل کش تھی اور خدوخال نہایت واضح تھے ۔

سیڈے کی زندگی کے ابتدائی حالات بہت کچھ اس کی اپنی کتاب الائن آف وال کورٹ (Allies of Wall Court) سے معلوم ہوتے ہیں اس نے لوئی ڈی گرینڈ کے اس کالج میں تعلیم حاصل کی جہاں سرمایہ داروں کے لڑکے تعلیم پاتے تھے ۔ دوران تعلیم میں اس کے غیر معمولی ذہنی رجحانات کا پتہ نہیں لگتا، کالج سے نکلنے کے بعد اپنی خاندانی روایات قایم رکھتے ہوئے کسی ملازمت کی تلاش کرکے کی بجائے فوج میں ملازم ہوگیا اور جلد ہی اعلیٰ منصب پر پہونچ گیا، ہفت سالہ جنگ میں جرمنی گیا اور وہاں بسمارک کی کیل کانٹے سے لیس فوج سے لڑا، میدان جنگ میں اس نے اپنے کو ایک قابل سپاہی ثابت کیا۔ ہوسکتا ہے کہ میدان جنگ کے خونیں مناظر نے سیڈے کی حساس فطرت پر انمٹ نقوش چھوڑے ہوں اور اس بے راہ روی کی ابتداء انہیں سے ہوئی ہو ۔

ہفت سالہ جنگ سے لوٹنے پر سیڈے کے باپ نے اپنے نوجوان بیٹے میں کچھ غیر معمولی تبدیلیاں دیکھیں اور سوچا کہ شاید یہ نوجوانی کا تقاضہ ہے، جوانی دیوانی ہوتی ہے اور اس دیوانگی کو روکنے کے لئے شادی کی فکر کی گئی اور سیڈے کے باپ نے اپنے دوست کی ایک بیس سالہ لڑکی سے شادی پکی کردی، یہ دوست بھی اسی حیثیت کے آدمی تھے اور مال دولت میں کچھ کم مقتدر نہ تھے شادی سے قبل ہی باپ نے سیڈے کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کرنے کا نہایت ہی عمدہ طریقہ سوچا اور اسے اپنے اس دوست کے پاس ایک پیغام لے کر بھیجدیا مقصد یہ تھا کہ سیڈے اپنی ہونے والی بیوی کو پہلے ہی دیکھ سکے، لیکن یہاں واقعات نے قطعاً غیر متوقع طور پر ایک نئی کروٹ لی، اتفاقاً اسوقت مکان پر سیڈے کی ہونے والی سالی کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا یہ ۱۳ سال کی ایک نوعمر لڑکی تھی اور نہایت ہی خوش آواز تھی کچھ تو لڑکی کی کم سنی کا تقاضہ اور کچھ سیڈے کی نفسیاتی حالت جو اس وقت جنسی احساسات سے لبریز تھی ۔ بہرحال محبت شروع ہوگئی دونوں وقتاً فوقتاً ملنے لگے، دونوں خوش آواز تھے دونوں موسیقی اور آرٹ کے سیڈائی ۔ جب یہ بھید والدین پر ظاہر ہوا تو یہ محبت کافی جڑ پکڑ چکی تھی ۔ والدین نے اس نئی محبت کو کوئی اہمیت نہ دی اور جلدی شادی کا سامان شروع کردیا، شادی ہوگئی اسی بیس سالہ دوشیزہ کے ساتھ ۔ اور سیڈے کے سارے رومان کا بہت بری طرح گلا گھونٹ دیا گیا اس کی محبوبہ اس کی پہونچ سے بہت دور ایک خانقاہ میں بھیجدی گئی جہاں اس نے نیم راہبانہ زندگی گزارنا شروع کردی ۔

دن گزرتے رہے لیکن محبت کی یہ آگ سیڈے کے دل میں ٹھنڈی نہ ہوسکی، حالانکہ اس کی بیوی نہایت حسین اور وفادار تھی، سیڈے کے تمام سوانح نگاروں نے اس کی بیوی کی بہت تعریف کی ہے ۔ پال گنسٹری لکھتا ہے " وہ ازدواجی زندگی میں ایک قابل پرستش دیوی کی حیثیت رکھتی تھی" اس کی محبت ہر قسم کے معاوضے سے بے نیاز تھی، اسے سیڈے سے

بے انتہا محبت تھی اور اس کے عوض کبھی اس نے سیڈے کی محبت جیتنے کا ارمان نہیں کیا اور یہی چیز سیڈے جیسے حساس انسان کے لئے سب سے بڑی ٹریجڈی بن گئی تھی وہ سیڈے کو عمر بھر دیوتا کی طرح پوجتی رہی حالانکہ اس کی پوجا کو سیڈے ہمیشہ شک و شبہ، نفرت و حقارت سے ٹھکراتا رہا۔ یہیں سے سیڈے کی زندگی میں عجیب اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔

ہفت سالہ جنگ کے خونیں مناظر کے پس منظر میں سیڈے کے پہلے اور آخری رومان کی شکست اور پھر اسکے بعد اپنی مجبوری کا احساس اور اسکے ساتھ اپنی محبت کی اس محبت کا خیال جسے وہ پرخلوص جانتے ہوئے بھی قبول نہیں کر سکتا تھا ۔ انہی سب چیزوں نے آگے چل کر اسے پاگل بنا دیا ازدواجی زندگی خوش و ناخوش گزرتی رہی بچے بھی ہوئے بیوی کی محبت بھی حاصل رہی لیکن سیڈے اپنی معشوقہ کو تو فراموش نہ کر سکا۔ پال گنسٹری اس کے بڑے لڑکے کے بارے میں لکھتا ہے "یہ لڑکا تندرست اور صحیح الدماغ تھا اس میں کسی قسم کے غیر معمولی رجحانات نہیں پائے جاتے تھے، عرصے تک فوج میں رہا اور قابل قدر خدمات انجام دیتا رہا نہ اس میں کسی قسم کی غلط روی کا شائبہ پایا جاتا ہے اور نہ کوئی مرض ۔"

—— لیکن سیڈے کا جنون ترقی پذیر رہا اس نے اپنی محبوبہ کے بارے میں عجیب عجیب تصورات قایم کرنے شروع کر دئے اور عالم تخیل میں ہمیشہ اسے پوجتا رہا۔ یہی تصور اس کی ناولوں میں جولیٹ کے نام سے نمودار ہوتا ہے اس پردے میں وہ اپنی معشوقہ کی مختلف تصویریں بناتا ہے انھیں پوجتا ہے اور ان سے مختلف خیالات وابستہ کرتا رہتا ہے تخئیل کی دُنیا لامحدود ہے اور اس لامحدودیت میں گم ہو جانے کے لئے سیڈے نے تنہائی اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن جنون عشق اسے پھر جہد و عمل کے میدان میں کھینچ لایا، بہر حال وہ کسی نہ کسی طرح سے خانقاہ تک پہونچا اور اپنی معشوقہ کو لیکر کسی دور دراز شہر کو بھاگ گیا

یہاں اس نے اپنی محبوبہ کے ساتھ کچھ دن مسرت و لطف کے بسر کئے اور شاید یہی اس کی زندگی کے پہلے اور آخری پرسکون ایام ہیں، ان دنوں رومان و مسرت کے سوا وہ ہر چیز سے بے خبر ہو گیا تھا لیکن یہ رومانی خوشی زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوئی اور اس کی محبوبہ کی اچانک موت واقع ہو گئی۔ سیڈے کے دماغ پر اس حادثے نے بہت اثر چھوڑا اس نے زندگی کو بے حقیقت سمجھ کر نہایت غیر سنجیدگی سے زندگی گزارنا شروع کر دی اپنے ان آلام کو بھلانے کے لئے وہ ان امرار اور نوابوں کی صحبت میں جا ملا جو دن رات عیاشی اور فحاشی میں غرق رہتے تھے، اپنی تھکی ہوئی زندگی کے لئے اطمینان و سکون کی چند گھڑیاں مہیا کرنے کے لئے اس نے تن من دھن کی بازی لگا دی، ایک طرف تو اس کا دماغ یوں ہی اس صدمہ سے ماؤف ہو چکا تھا دوسرے عیاشی اور فحاشی ۔ انجام ظاہر ہے۔ اس کے جنسی رجحانات نہایت خطرناک شکل میں ظاہر ہونا شروع ہوئے یہ انفرادی مزاج پسندی بڑھتے بڑھتے سیڈزم کی ابتدا ٹھہری لہو و لعب، عیش و عشرت، شراب و شباب کے اس ہنگامے میں اپنی صحت جسمانی اور صحت دماغی کھونے کے بعد مخیلات جنسی نظریوں سے رنگ پکڑنا شروع کیا اور جرائم پسندی کے جذبے نے جنم لیا۔

اس کی جرائم پسندی کی داستانیں بہت مشہور ہیں، یہ صحیح ہے کہ اس میں خون کی یہ پیاس اور ظلم پسندی کا میلان پایا جاتا تھا لیکن اس کے جرائم کی نوعیت اکثر تخئیلی تھی اور اس کے پیدا کئے ہوئے کردار اس سے زیادہ خونی اور قاتل ہوتے تھے، وہ جرائم پر عمل درآمد کرنے سے زیادہ ان کے بارے میں تخئیلی نظریے زیادہ قایم کرتا تھا اور انھیں خونیں نظاروں سے حظ حاصل کرتا تھا۔ JULES JANIN نامی فرانسیسی نقاد لکھتا ہے:

"—— وہ ایسی لاشیں پیش کرتا ہے جن سے خون کے فوارے بہتے ہیں، ایسے بچے پیش کرتا ہے جو جبراً ماؤں کی گود سے چھین لئے گئے ہیں اور توڑ مروڑ کر پھینک دئے گئے ہیں، ایسی دوشیزائیں دکھاتا ہے جن کے نرخرے چبا ڈالے گئے ہیں، ایسے ساغر دیتا ہے جس میں شراب کے ساتھ ساتھ انسانی خون ملا ہوا ہے وہ ایسے مظالم بیان کرتا ہے جو نہ کبھی دیکھے گئے نہ سنے گئے، بھٹیاں روشن ہوتی ہیں، پھانسیاں لگائی جاتی ہیں، آدمی اُبالے جاتے ہیں اور ان کی کھالیں کھینچ لی جاتی ہیں۔ یہ چیختے ہیں، چلاتے ہیں اپنے ہونٹ چباتے ہیں ہاتھ کاٹتے ہیں اپنے سینے پیٹتے ہیں، اور یہ خونیں نظارے ایک دو جگہ نہیں بلکہ اس کی تصانیف کے ہر ہر ورق پر اور ہر ہر لائن پر بکھرے پڑے ہیں۔ اپنی پہلی کتاب جسٹن (JUSTINE) میں وہ ہمیں ایک ایسی غریب لڑکی سے متعارف کراتا ہے جو اغوا کرلی جاتی ہے تباہ و برباد ہوتی ہے، بدمعاشوں کے ہاتھ پڑتی ہے اور سیکڑوں زمیں دوز سرنگوں اور ہزاروں قزاقوں کی پارٹیوں میں گھمائی پھرائی جاتی ہے زدوکوب کیجاتی ہے اور عجیب عجیب مظالم سے دوچار ہوتی ہے۔ جب مصنف دنیا بھر کی فہرست بیان کرچکتا ہے، ہر قسم کے انتہائی ہیبت ناک اور غضبناک مظالم کا تذکرہ کرچکتا ہے تو ان لاشوں پر ہانپتا کانپتا آن کر رُک جاتا ہے جنھیں خود اس نے اپنے ہاتھوں سے ذبح کیا ہے، اور جب اس کی فطرت اس خیال سے تسکین پاجاتی ہے کہ اب دنیا کی کوئی ایسی خانقاہ نہیں رہ گئی جسے اس نے تباہ و برباد نہ کر ڈالا ہو، کوئی ایسا بچہ نہیں رہ گیا جسے اس نے اپنی انتقامانہ آگ سے بھلس نہ دیا ہو، کوئی ایسا اخلاقی خیال نہیں بچا جس پر اس نے اپنے خیالات اور مقولات سے کیچڑ نہ اُچھال لی ہو — تب وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھہرتا ہے ایک بار اپنے پر نظر کرتا ہے اپنے اوپر مسکراتا ہے اور اپنے سے دہشت نہیں کھاتا۔"

یہ تو تھے اس کے تخیلی جرائم، لیکن جہاں تک اس کے عملی جرائم کا تعلق ہے صرف دو جرائم کا پتہ بالتحقیق لگ سکا ہے اور یہ دونوں جرائم اس کی تخیلی جرائم سے زیادہ خوفناک نہیں۔ ۱۷۶۸ء میں اس نے ایک نوجوان بھکارن (ROSA KELLER) کو بہت بُری طرح مجروح کیا، روز اسے سرراہ اس سے بھیک مانگی تھی اور یہ اسے کسی نہ کسی طرح بہلا پھسلا کر اپنے گھر لے آیا اور بعد میں اسے بہت بری طرح مجروح کیا، کچھ دنوں بعد مارسیلز کی ایک طوائف کو اس نے زہریلی مٹھائیاں کھلائیں۔ جرائم پسندی کا یہی رجحان رفتہ رفتہ بڑھ گیا اور جب اس پاداش میں اسے قید کر دیا گیا تو قید خانے کی پُر آلام زندگی اور وہاں کی ہیبتناک تنہائی اور اُداسی نے اس کے ان رجحانات کو پختہ کر دیا۔

سیڈے کا کردار اس قدر عظیم و بلند رہا ہے کہ اس نے کبھی کسی کی "شرکت غم" بھی گوارا نہیں کی، ساری عمر بے سہارے گزاری وہ انسانی ہمدردی اور یزدانی انصاف سے بالاتر رہا اور اس نے ساری عمر اسی بلندی پر اسی عظمت اور اسی بلند کرداری کے ساتھ گزار دی اس کے لب کبھی اس کے پُر الم افسانوں سے آشنا نہ ہوئے اور اس نے اپنی ساری زندگی انہی قہقہوں میں گزار دی جن سے لوگوں کو آج تک خون کی بو آتی ہے، ان گہرے زخموں اور ہمیشہ رستے ہوئے ناسوروں کو دبائے ہوئے وہ ہمیشہ مسکراتا، ہنستا اور قہقہے لگاتا رہا خوفناک خونیں قہقہے۔ ان تاریک ایام میں اس کا پہلا اور آخری ذریعۂ اظہار تصنیف و تالیف رہا، شادی کے فوراً ہی بعد کوئی ۲۳ سال کی عمر میں اس نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا کچھ دنوں یہ سلسلہ بہت جوش سے جاری رہا اور قید خانے میں اس کا یہ شوق اور زیادہ زور پکڑ گیا۔

اگر ہم ان ۱۳ سالوں کو بھی شامل کرلیں جو اس نے چارنٹین کے پاگل خانے میں گزارے تو اس کی قید کی کل مدت ۲۷ سال ہوتی ہے، لیکن اس کی بوقلمون شخصیت اپنے جوہر دکھائے بغیر نہ رہ سکی۔ آرٹسٹ، طالب علم، فلاسفر،

وہ ہر حیثیت سے قابل ذکر ہے۔ ناول نگاری اس کا محبوب مشغلہ تھا اس کے کرداروں اور پلاٹ کے بارے میں آپ نے جینن کی رائے ملاحظہ کی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے کردار کتنے عجیب قسم کے تھے اور اسی لئے اس کی ناولوں نے جلد ہی اپنے لئے شاہراہ عام سے الگ ہٹ کر ایک نئی راہ پیدا کر لی۔

ناولوں ہی میں نہیں بلکہ اس کی فلسفیانہ اور سنجیدہ تصانیف میں بھی یہی انفرادیت پائی جاتی ہے، ماہرین نفسیات اس معاملہ میں تقریباً متفق الرائے ہیں کہ سیڈے پہلا انسان تھا جس نے جنسیت کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کیا اور زندگی میں اس کے اثرات کو واضح طور پر سمجھا ہیولاک ایلس ایک مفکر کی حیثیت سے اس کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے لکھتا ہے

"—— اس کی تصانیف شہوانی جذبے کی بے راہ روی میں انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہیں ان تصانیف سے نہ صرف ۱۸ ویں صدی کے شہوانی رجحانات کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ تصانیف شہوانیات کو فلسفہ کی باقاعدہ شکل دے دیتی ہیں"

IRAN BLOCK نے سیڈے کے مجموعۂ تصانیف پر دیباچہ لکھتے ہوئے اس دعوی کی دلیل میں اسکی تصانیف کے مختلف اقتباسات پیش کئے ہیں ان میں سے ایک مختصر سا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے اس سے نہ صرف سیڈے کی علمیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ شہوانیات کے بارے میں اس کے خیالات کیا تھے اور وہ کس طرح زندگی کے ایک نئے زاویۂ نگاہ کو پیش کرتا تھا:

"—— اگر دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے اعمال مسلمہ تعصبات اور مقررہ روایات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے ہیں تو ان لوگوں کے اصلاح کرنے کی کوشش، سزا و سرزنش یا پند و نصائح کی مدد سے کرنا قطعی فضول ہے۔ ان کے رکیک مذاق اور گرے ہوئے اخلاق کی ذمہ داری خود ان پر عاید نہیں ہوتی بلکہ بلا استثناء سب پر عائد ہوتی ہے۔ اگر یہ پتہ لگ جائے کہ ایک خاص قسم کے عناصر سے تشکیل پا جانے یا ایک خاص قسم کی تلخ مزاجی اور ایک خاص قسم کے حیوانی عنصر کی موجودگی سے ایک فرد سرزنش یا ستایش کا مستحق گردانا جا سکتا ہے تو پھر تمہارے یہ تمام قاعدے قانون یہ سارا اخلاقی نظام یہ تمام رسوم و روایات کا دفتر، یہ مذاہب کی جھنجٹ، جنت و دوزخ کے یہ کھلونے، خدا اور شیطان کے تصورات، جیل کے دروازے اور پھانسی کے پھندے کسی کام کے نہ رہیں گے"

اس چھوٹے سے اقتباس سے جہاں اس کی بلندیِ فکر اور ترتیب خیالات کا اندازہ ہوتا ہے وہاں اسکے آرٹسٹک طرز بیان اور بے پناہ قوت اظہار کا عکس دکھائی دیتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ اس کے وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہو اُس کی قوتِ مشاہدہ کافی تیز تھی مشاہدہ اور اس کے ساتھ ساتھ مطالعہ گویا سونے پر سہاگا ہوا۔ ہو سکتا تھا کہ اگر وہ "غم پنہاں" سے تھوڑی سی بھی فرصت پا جاتا تو دُنیا کے ان مصنفین میں شامل ہو سکتا جو صف اول میں گنے جاتے ہیں، ادب، فلسفہ، دینیات، سیاسیات، تاریخ و اجتماعیات، کے بارے میں اس کا علم لامحدود تھا اسے سفرنامے اور تاریخ سے خاص شغف تھا، انجیل کا گہری نظر سے مطالعہ کر چکا تھا اور ظاہر ہے کہ نقاد کی نظر ہمیشہ ایک عام پڑھنے والے سے گہری اور تیز ہوتی ہے اس نے انجیل پر اعتراضات کئے ہیں جو اس کے تنقیدی اور تفصیلی مطالع کا نتیجہ ہیں میکاولی اور لیمتری (Macchiavelli & Lamettrie) اس کے محبوب مصنف تھے قید خانہ میں اس کا پہلا ناول جسٹین ۱۷۸۱ء میں مکمل ہوا اسی سال اس کی دوسری

کتاب "جرنیز ڈی سومی اکول ڈولیبرٹینگ (Journees de Soame ou L'ecole du Libertinage) مرتب ہوئی پھر ۱۷۹۸ء میں (Aline et Valcour ou le Roman Philosophique) مرتب ہوئی پھر ۱۷۹۶ء میں اس کا مشہور و معروف ناول (Juliette) جولیٹ تصنیف ہوا جس کے بارے میں جینن (Janin) کا مفصل تبصرہ ابھی گزر چکا ہے۔ اس کی بوقلموں شخصیت کا اندازہ اس کی رنگارنگ تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے جولیٹ ایک ناول ہے ہو سکتا ہے آپ اسے زیادہ وقعت نہ دیں کیونکہ آرٹ میں کوئی چیز بھی یقینی نہیں کہی جا سکتی لیکن اس کی فلسفہ پر بھی ایک سیر حاصل کتاب موجود ہے اور ظاہر ہے قید خانے کی بے سکون زندگی میں فلسفہ کی اہم کتابوں کی غیر موجودگی میں یہ کارنامہ کچھ کم قابل ستایش نہیں — !

کثرت مطالعہ اور اس کی اپنی ذاتی بصیرت نے اس میں اتنی دور اندیشی پیدا کر دی تھی کہ قید خانے کی اس تنگ و تاریک کوٹھری ہی سے اس نے انقلاب فرانس کے آثار دیکھ لئے تھے اور اسی فلسفیانہ دور بین اور سیاسی شعور کی بنا پر اس واقعہ کے پیش آنے سے کہیں پہلے اس کی پیشین گوئی کی تھی جب (Bastille) اور فرانس کے دوسرے قید خانوں سے ان قیدیوں کی رہائی ہوئی جو اپنی عمر کی بہاریں ان تنگ و تاریک کوٹھریوں کی نذر کر چکے تھے تو سیڈے نے بھی قید خانے سے باہر نکل کر فرانس کی تازہ ہوا میں سانس لیا لیکن یہ سانس اطمینان کا سانس نہ تھا۔

فرانس میں انقلاب پسندوں کے ہاتھوں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا برسوں کی محکوم انسانیت نے اپنی زنجیریں مجنونانہ جوش اور جانبازی سے توڑنا شروع کر دی تھیں برسوں کے مسلط شدہ جاگیردارانہ نظام کو توڑنے پھوڑنے کے لئے جو لرزا دینے والے واقعات پیش آئے وہ کچھ غیر متوقع نہ تھے سیڈے کے خونخوارانہ رجحانات ایسے موقعہ پر بہت کچھ رنگ لا سکتے تھے ایسی حالت میں جبکہ نفسی نفسی کا عالم تھا ہر طرف نراج کا دور دورہ تھا سیڈے چاہتا تو ہزاروں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ سکتا، لیکن سنجیدگی اور تجربہ کاری سیڈے کے ہاتھ سے آخر تک نہ چھوٹی اس نے انتہا پسندوں کے ساتھ لوٹ مار میں حصہ لینے کی بجائے سیاست کے بندوں سے روکنا چاہا۔ ان دنوں وہ نہایت پر امن رہا ایک ہسپتال میں نہایت جانفشانی سے کام کرتا رہا اور سیکڑوں بندگان خلق کی جانیں بچائیں پھر اپنے ساس اور سسر کو (جنھوں نے اس کی زندگی کو جہنم بنایا تھا) پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے روک لیا اپنی پُر امن سرگرمیوں کی بنا پر وہ جلد ہی انتہا پسندوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا ادھر اس کے اعتدال پسندی بڑھتی گئی اور وہ رفتہ رفتہ اس خیال کا پیرو ہو گیا کہ ظلم و ستم، قتل و خون کا یہ سیلاب جلد از جلد ختم ہو جانا چاہئے انھیں دنوں اسنے نپولین بوناپارٹ اور اس کی معشوقہ جوزافائن کے خلاف ایک پمفلٹ لکھا جس میں صرف نپولین کے مطلق العنان بنائے جانے کی صریحاً مخالفت کی گئی تھی بلکہ ان دنوں کے پرائیویٹ تعلقات کو سامنے لا کر ان کا مضحکہ بھی اڑایا گیا تھا۔ نپولین سپاہی تھا اور سیڈے سپاہی رہ چکا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ فرانس کی قسمت ایک ایسے سپاہی کے ہاتھ میں چلی جائے جسے خون انسانی کی صحیح قدر و قیمت معلوم نہ ہو اس زمانہ کے فرانس میں پُر خلوص مخالفوں کے لئے بھی کوئی جگہ نہ تھی رواداری اور افہام و تفہیم بے معنی الفاظ تھے اور مخالفین کو جیلوں اور پاگل خانوں میں سڑا دینا اور پھانسی کے تختوں پر لٹکوا دینا معمولی سزائیں سمجھی جاتی تھیں۔

نپولین برسر اقتدار تھا اور اس کے حمایتیوں نے اس سنگ گراں کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے سیڈے کو پاگل قرار دے کر چارنٹن کے پاگل خانے میں ڈلوا دیا جہاں اس نے اپنی زندگی کے بقیہ دن گزار دئے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے آیا سیڈے درحقیقت پاگل تھا یا نہیں؟ رائر کالرڈ، فرانس کا مشہور ڈاکٹر گزرا ہے وہ نہ صرف جنون کے علاج میں ماہر واقع ہوا تھا بلکہ ان دنوں چارنٹن کے پاگل خانے کا نگراں بھی وہی تھا لہذا اسکی رائے ہر طرح سے مستند مانی جا سکتی ہے وہ اپنی اس رپورٹ میں جو آج تک محفوظ ہے سیڈے میں غیر معمولی نفسیاتی رجحانات کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اسے پاگل قرار نہیں دیتا ایون بلاک نے سیڈے کے مجموعۂ تصانیف کے دیباچے میں ان تمام حکماء کی رائیں تفصیل سے نقل کی ہیں جو اسے پاگل قرار نہیں دیتے، ایلین برگ اس کو ماؤف الدماغ قرار دیتے ہوئے بھی پاگل نہیں بتاتا کچھ حکماء اسے اعصابی مریض بتاتے ہیں لیکن پاگل پن کے آثار نہیں پاتے۔ اگر ڈاکٹروں کی رایوں کو کوئی اہمیت نہ دیجائے تو بھی سیڈے کی پاگل خانے والی زندگی میں خود ایسے شواہد موجود ہیں جن کی بنا پر اسے عاقل و فرزانہ کہنا پڑتا ہے اسی پاگل خانے میں اس نے ایک تھیٹر بنایا تھا اور اس تھیٹر میں نہ صرف اس کے اپنے ڈرامے کھیلے جاتے تھے بلکہ بڑے بڑے مصنفین کے ڈرامے بھی اسٹیج ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ بہت سے ایسے ثبوت فراہم کئے جا سکتے ہیں جن سے وہ پاگل ثابت نہیں ہوتا لی کرائکس (Le Croix) جب اس کی سوانح حیات لکھنے لگا تو اس نے وہاں کے لوگوں سے سیڈے کے بارے میں کچھ پوچھ گچھ کی اور یہ سنکر سخت متعجب ہوا کہ وہ تمام باعزت اور شریف النفس لوگ سیڈے کو قابل احترام جانتے اور عزیز رکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ ایک پاگل یہ عزت یہ معصومیت حاصل نہیں کر سکتا۔ عورتوں میں وہ حیرتناک طور سے مقبول تھا شاید کوئی اور آدمی فرانسیسی عورتوں میں اس قدر پسند کیا جاتا ہو۔ جینن لکھتا ہے کہ اس نے ایسے لاتعداد خطوط دیکھے جو نوجوان اور خوبصورت دوشیزاؤں نے اپنے "محبوب مارکوئیس" کی رہائی کے لئے سفارشی طور پر حکومت کو لکھے تھے۔

گو اس کی رہائی کبھی عمل میں نہیں آئی لیکن وہ گردونواح میں پاگل کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک قابل احترام ہستی کی حیثیت سے مقبول رہا، مشہور ڈرامسٹ ساردان (Sardon) نے لکھا ہے کہ جب ۱۸۵۵ء میں وہ باسٹرے (Bastia) گیا تو وہاں اسے ایک بوڑھا مالی ملا یہ سیڈے سے واقف تھا اس مالی کا بیان ہے کہ سیڈے کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ روز خوبصورت سے خوبصورت اور قیمتی سے قیمتی گلاب سونگھا کرتا تھا وہ انھیں ایک ایک کرکے دیر تک سونگھتا رہتا پھر مسکراتا خوب مسکراتا اور سامنے والے گندے تالاب کی کیچڑ میں لت پت کرکے پھینک دیتا اور پھر بہت دیر تک زور زور سے ہنستا رہتا۔

۱۰ دسمبر ۱۸۱۲ء کو وہ اسی پاگل خانے میں تھک کر ہمیشہ کے لئے سو گیا اخیر عمر میں وہ خرابی ہضم، گٹھیا اور دمہ جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو گیا تھا آنکھوں سے بھی سجھائی نہ دیتا تھا لیکن اس اندھے سپاہی نے اخیر وقت تک بے پناہ اذیتوں اور بے شمار صدمات کے مقابلہ میں بھی ہمت نہ ہاری عرصہ تک لوگوں کو سیڈے کی عظمت کا احساس نہ ہوا لیکن تھوڑے دنوں بعد یہ غفلت دور ہوئی ڈاکٹروں نے اس کا سر خریدا اور اس کی صحیح قدر و قیمت پہچانی ایک فرانسیسی

ڈاکٹر جس نے اس کا سر پہلی بار خریدا تھا اس کے سر کے بارے میں لکھتا ہے :-

"سر بہت چھوٹا ہے اور نہایت مناسب انداز میں بنا ہوا ہے، پہلی نظر میں ہر شخص اسے عورت کا سر سمجھنے لگتا ہے"

یہ سر عرصے تک ڈاکٹر لانڈے کی ملکیت رہا دس صدی میں ڈاکٹر لانڈے کے معمل سے کوئی ڈاکٹر اسے چرا لے گیا اور سر انگلستان پہونچا وہاں اس پر مختلف نتائج مرتب ہوئے اور ممکن ہے کہ آج بھی وہ انگلستان کے کسی ڈاکٹر کے معمل میں موجود ہو۔

---

سیڈے نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پر "اوک" کا درخت بویا جائے اور اس کی یاد کو جلد فراموش کر دیا جائے، اس کی پہلی وصیت پوری ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن اس کی دوسری وصیت کبھی پوری نہ ہوگی، وہ ناقابل فراموش ہو گیا ہے، وہ غیر فانی ہے اور دنیائے نفسیات کا ہمیشہ زندہ رہنے والا ہیرو بن گیا ہے وہ آج بھی ایک ہیرو کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا رہے گا اس کی شخصیت کے مختلف پہلو اور اس کی نفسیات کے مختلف پہلو سامنے آتے رہیں گے !

محمد حسن بی۔اے

---


# مُغل لائن لمیٹڈ

لڑائی کے زمانہ میں ہمارے ان جہازوں کے اوقات جو سامان اور مسافروں کو عدن، جدہ، پورٹ سوڈان، مصر اور مارسیلس تک لیجاتے تھے، مجبوراً بے قاعدہ ہو گئے ہیں، لیکن صلح اور فتح کے بعد کمپنی کے تمام جہازوں کی آمد و رفت پھر باقاعدہ ہو جائے گی اور مسافروں اور سامان بھیجنے والوں کے لئے بدستور سابق پھر آسانیاں ہو جائیں گی۔

ٹرنر مارسین اینڈ کو

مینیجنگ ایجنٹس مغل لائن کمپنی

۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

# چاند

(ڈرامہ)

## افراد :

| | | |
|---|---|---|
| سلیم<br>ثریا | میاں بیوی | |
| نسرین | سلیم کی لڑکی | |
| کریم درزی<br>فیروزہ | بہن بھائی | |
| گبرو | گجریا کا عاشق | |
| امراؤ<br>دلدار | گبرو کے رقیب | |

ایک چلتی ہوئی سڑک ہے۔ جس پر مختلف قسم کا شور وغل ہو رہا ہے۔ کئی آوازیں ایک ساتھ مل کر کہتی ہیں " ہوگیا - ہوگیا - ہوگیا"۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہیں - پھر جیسے کوئی نیچے کے حصہ سے اوپر کی طرف دیکھ کر پوچھ رہا ہے۔

---

۱ - ہوگیا ؟

۲ - ہوگیا ؟

۳ - ہاں ہوگیا ہوگیا۔

یہ ایک مکان ہے، جس کی تین منزلیں ہیں۔ یہاں انسان انسانوں کے سروں پر کھڑا ہے اگر کچھ اور منزلیں ہوتیں تو یہ سوال اور اوپر تک جاتا۔

۱ - ہاں ہو تو گیا، وہ کیا دکھائی دے رہا ہے ؟

۲ - واقعی ہوگیا (ہنسکر) کتنے بیوقوف ہیں ہم لوگ آخر ہم نے اوپر والوں سے پوچھا ہی کیوں

۳ - اور ہم سے اوپر والوں نے اپنے اوپر والوں سے بھی تو پوچھا۔ (ہنسکر) دنیا شاید نیچے سے اوپر کی طرف جاتی ہے۔

(سڑک پر پھر اُسی طرح کا شور وغل ہے اور ہوگیا، ہوگیا کی آوازیں بلند ہو کر ختم ہو جاتی ہیں)

سلیم : ثریا کہاں ہو - ہوگیا -

ثریا : ہوگیا ؟

سلیم = وہ دیکھو سامنے

ثریا = ہاں دیکھا میں نے - مبارک ہو

نسرین (تلاکر) پاپا ہودیا - ہودیا - ہودیا -

سلیم (محبت سے) ہاں بیٹی ہوگیا

ثریا = نیچے زرا کریم درزی سے تو پوچھئے کہ آپ کی شیروانی اور نسرین کا سوٹ کب دے گا ؟

(سلیم جاتا ہے - مشین کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے)

سلیم = (پکارتے ہوئے) ارے کریم ماسٹر، اے کریم ماسٹر-

کریم = جی بابو صاحب

سلیم = ذرا اوپر دیکھو

کریم = جی سرکار

سلیم = اے، وہ شیروانی اور بچی کا سوٹ کب ملیگا ؟

کریم = شیروانی تو مشین پر ہے سرکار، اور نسرین بٹیا کے سوٹ میں بٹن ٹانکے جارہے ہیں - کیا ہوگیا؟

سلیم = ہاں بھائی ہوگیا - تمھیں خبر بھی نہیں ؟ کیا خوب

کریم = بڑا غضب ہوگیا - آج اور نہ ہوتا تو کتنا اچھا تھا

(پکارتا ہے) اری فیروزہ کہاں گئی -

فیروزہ = میں یہاں ہوں بھیا، بٹن ٹانک رہی ہوں -

کریم = ذرا جلدی جلدی ٹانک نا، ابھی اور بہت سے کپڑوں میں بٹن ٹانکنا ہیں - "ہوگیا"

فیروزہ = ابھی کہاں ہوا ہے بھیا، بڑی دیر سے بیٹھی دیکھ تو رہی ہوں -

(دفعتاً رونے کی آواز سنائی پڑتی ہے)

سلیم = یہ رو کون رہا ہے ؟

کریم = نیچے کے حصہ میں بڈھے کے یہاں ہے کوئی

سلیم (ہنسکر) کیا کہہ رہی ہے فیروزہ - ابھی ہوا ہی نہیں ؟

کریم = (سرد آہ بھرکر) جی ہاں، جوان بیوہ ہو دیکھا ہی نہ ہوگا اس نے پار سال جب اس کا شوہر زندہ تھا تو دھوپ کی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی - مگر اب -----

---

سلیم (واپس آکر) - میں نے تقاضا کر دیا ہے، شیروانی مشین پر ہے اور سوٹ میں بٹن ٹانکے جارہے ہیں -

ثریا = مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح تک شیروانی مشین ہی پر رہے، درزیوں کے بہانے آپ نہیں جانتے میں خود جاکر تقاضا کرتی ہوں -

(جاتی ہے اور پکارتی ہے)

ارے فیروزہ - اے فیروزہ -

فیروزہ = جی بیگم صاحبہ

ثریا = وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو - چاند دیکھا تم نے ؟

فیروزہ = نہیں، ہوگیا کیا ؟

ثریا = ہاں ہوگیا - سب کپڑے رات ہی کو ملجائیں -

فیروزہ = بہت اچھا - آج نیچے والے حصہ میں بہت سے لوگ جمع ہیں بڈھے کے یہاں -

ثریا = کیوں کیا ہوا ؟

فیروزہ = گجریا کو جانتی ہیں آپ ؟

ثریا = ہاں، ہاں وہ اندھے فقیر کی لڑکی -

فیروزہ = جی ہاں اس پر آج بڑی مصیبت ہے -

(رونے کی آواز آتی ہے)

ثریا = یہ وہی رو رہی ہے ؟

فیروزہ = جی ہاں صبح سے یہ وقت آیا اسی طرح روتے پیٹتے

ثریا = آخر بات کیا ہے، جو اس طرح بیتابی سے روئے جاتی ہے ؟

فیروزہ = نیچے آجائیے ذرا - بڈھے کے گھر آج بہت سے لوگ جمع ہیں اور طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں -

ثریا = آخر کیا ایسی تکلیف ہوگئی، کل تک تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔

فیروزہ = یہاں آجایئے نیچے۔ میں دوکان کا دروازہ بند کئے دیتی ہوں۔ آپ یہاں نیچے آجایئے۔

ثریا = اچھا دروازہ بند کرو میں آتی ہوں۔
(سیڑھیوں سے اُترنے کی آواز)

---

فیروزہ = ہاں ہاں چلی آیئے، دوکان کا دروازہ بند ہے
(رونے اور کراہنے کی آواز زیادہ قریب سے سنائی دیتی ہے)

ثریا = (سرگوشی کے انداز میں) اچھا یہ بات ہے۔ آہ کیسی مصیبت ہے غریب پر۔

فیروزہ = ذرا باتیں تو سنئے ان لوگوں کی کیسی باتیں کر رہے ہیں کم بخت۔

---

گبرو = بولو یار اب کیا کروں مجھ سے تو اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔

دلدار = تکلیف نہیں دیکھ سکتا تو سر زمین پر دے مار

امراؤ = اور میں تو کہتا ہوں دلدار بھیا کیا گبرو کو اسدن کی خبر نہ تھی جو دھیلی روپیہ گانٹھ میں بچا رکھتا۔

دلدار = ارے بے شرم ڈوب مر چلو بھر پانی میں۔
(دردناک کراہ کی آواز آتی ہے)

گبرو = تم ہی دلدار بھائی ایک روپیہ کا انتظام کردو یوں تو دائی دو روپیہ لیتی ہے مگر میں ہاتھ پاؤں جوڑ کر ایک ہی پر لے آؤں گا۔

دلدار = ابے روپیہ کس کے پاس ہے اور میں تو یہ کہوں کہ پہلے سے تو نے اس کی فکر کیوں نہ کی؟

امراؤ = چھوڑو یار اب نصیحت کا وقت نہیں۔ تم اٹھنی نکالو اٹھنی کا میں انتظام کرتا ہوں۔

دلدار = تم سب گدھے ہو یہ جو اوپر والے حصہ میں بابو صاحب رہتے ہیں، یہی دیں گے اور بلکنے دو گجریا کو اسی طرح۔

گبرو = ارے نہیں دلدار بھائی وہ مر جائے گی مجھے تم دونوں ایک روپیہ دو میں پیٹ کاٹ کر تمھیں ادا کر دوں گا۔

---

ثریا = یہ گبرو کون ہے؟

فیروزہ = اسی کا تو سب کیا دھرا ہے وہ دیکھئے بیگم صاحبہ وہ جو کنارے بیٹھا ہوا ہے۔

ثریا = ہاں ہاں جس کے بالوں میں تیل چمک رہا ہے؟

فیروزہ = جی ہاں یہی ہے وہ بدمعاش۔ حرامی نے بڈھے کو جیتے جی مار ڈالا۔

ثریا = تو پھر اب کیا کیا جائے۔

فیروزہ = کیا کیا جا سکتا ہے۔ بیگم صاحبہ جیسا کیا ہے، کمینی آپ ہی بھگتے گی۔ گنہگار کی مدد نہ کرنا چاہئے

ثریا = مگر سوال تو جان کا ہے۔ آخر یہ ہوا کیسے؟ گبرو اسی کے ساتھ رہتا ہے؟ اور وہ کہاں ہے گجریا کا اندھا باپ؟

فیروزہ = کہیں منہ چھپائے پڑا ہوگا،

ثریا = باپ اندھا لڑکی جوان، یہ ہونا ہی تھا۔

فیروزہ = اور پھر مفلسی بیگم صاحبہ، سب سے بڑا گناہ تو یہی ہے۔

ثریا = چُپ رہو نیچے لوگ پھر باتیں کر رہے ہیں۔

گبرو (گھبرا کر)۔ اچھا سنو دلدار بھائی میں گجریا کو تمھیں دیتا ہوں اگر جی بچ گئی تو تمھاری۔ اسوقت تو اس کی جان بچاؤ۔

دلدار = مگر اُستاد گجریا ایسا کب کرنے دے گی ---

(رونے کی اور کراہنے کی خوفناک آواز پھر آتی ہے)

گبرو = بس اب رحم کر دیا رو میں گجریا کو خوشی سے چھوڑتا ہوں جو اسکی جان بچائے وہی لیجائے۔

دلدار = (رضامند ہوتے ہوئے) اچھا تو پھر چھوڑ دیگا مگر بدل نہ جانا بیٹا بولو اُمراؤ بھیا، تمھارے سامنے وعدہ کر رہا ہے۔

اُمراؤ = بدلے گا کیسے ؟ مرد کی ایک زبان

دلدار = ارے یہ گبرو پورا ابلیس ہے۔ اچھا کھا اللہ میاں کی قسم۔

گبرو = قسم اللہ کی میں کوئی مطلب نہ رکھوں گا گجریا سے

دلدار = اچھا تو چل مسجد میں چل کر قسم کھا۔

اُمراؤ = ہاں ٹھیک ہے خوب پکی پوڑھی کرلو۔

دلدار = چلو پچھواڑے والی مسجد میں چلکر ابھی قسم کھاتا ہوں

---

ثریا = (پھولی ہوئی سانس کے ساتھ) میرا روپیہ کا بٹوا کہاں ہے ؟

سلیم = کیا ہوا اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو ؟

ثریا = میرا بٹوا بتا دیجئے جلدی سے فوراً

سلیم = آخر ہوا کیا ؟

ثریا = (گھبراہٹ اور عجلت کے ساتھ) ارے وہ جو گجریا رہتی ہے نیچے کے حصہ میں ؟.....

سلیم = (بات کاٹ کر) مرگئی وہ ؟

ثریا = نہیں، مر رہی ہے — بتا دیجئے خدا کے لئے جلدی بتا دیجئے میرا بٹوا کہاں ہے صبح سے یہ وقت آیا ہے اُسے تڑپتے ہوئے، بڑی تکلیف ہے غریب پر اللہ رحم کرے، جلدی سے پانچ روپے نکال دیجئے تاکہ وہ کسی دائی کا انتظام کرسکیں

روپیوں کی جھنکار سُنائی دیتی ہے گجریا کی مسلسل دردناک چیخوں کے بعد لوگ اکدم سے چلا اُٹھتے ہیں۔

"ہوگیا - ہوگیا - ہوگیا - ہوگیا"

پھر کوئی اوپر کے حصہ سے نیچے کے حصہ کی طرف جھانک کر پوچھتا ہے۔

۱ ہوگیا ؟

۲ ہوگیا ؟

۳ ہاں ہوگیا - ہوگیا

(بچہ کے رونے کی آواز سنائی پڑتی ہے)

۱ واقعی ہوگیا۔ (ہنسکر) کتنے بیوقوف ہیں ہم لوگ آخر ہم نے نیچے والوں سے پوچھا ہی کیوں ؟

۲ اور ہم سے نیچے والوں نے اپنے نیچے والوں ہی سے تو پوچھا معلوم ہوا دُنیا اوپر سے نیچے کی طرف بھی چلتی ہے۔

(یہ ایک مکان ہے۔ اس کی تین منزلیں ہیں۔ یہاں انسان انسانوں کے سروں پر کھڑا ہے، سوال اوپر سے چلا ہے، اگر اس مکان کی اور منزلیں زمین کے اندر ہوتیں تو اور نیچے تک چلا جاتا)

انتصار نیوتنوی

البرامکہ ساتواں اڈیشن مولفہ مولوی عبدالرزاق - اس اڈیشن میں ۳۰۰ صفحات کا مزید اضافہ ہوا ہے۔ طباعت وکتابت وغیرہ نہایت نفیس - مجلد قیمت علاوہ محصول چھ روپیہ آٹھ آنے ... منیجر نگار

# مالہ وماعلیہ

ستمبر کے رسالہ شاعر میں حضرت سیماب کی ایک غزل ("دل کی بات" کے عنوان سے) شایع ہوئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جس بحر اور ردیف و قافیہ میں یہ غزل لکھی گئی ہے، اس کا رکھ رکھاؤ ہر شاعر کا کام نہ تھا۔ جناب سیماب مشکل زمینوں اور شکستہ بحروں میں بسا اوقات ایسے بیساختہ شعر کہہ جاتے ہیں، جن سے نہ صرف ان کی کہنہ مشقی کا پتہ چلتا ہے، بلکہ یہ بھی کہ وہ معیار تغزل کو قایم رکھنے کی کتنی کوشش کرتے ہیں۔ غزل ملاحظہ ہو:

راز آشنائی کا راز آشنا جانے — دل سے جو نہ ہو آگاہ۔ دل کی بات کیا جانے
اُس کی بے نیازی کا وزن کوئی کیا جانے — جو نہ سیر دامن ہو اور نہ مانگنا جانے
عشق ہے تجاہل کیش، حُسن ہے تغافل خُو — میرا ذمہ دارِ غم، کون ہے خدا جانے
جانتا ہے وہ اُس کا رازِ جلوہ پیرائی — جو نگاہ کی حد سے دور دیکھنا جانے
یہ تو میری نظروں نے، دلنوازیاں دی ہیں — ورنہ وہ نظر رسمِ التفات کیا جانے
میری ہر نظر سجدہ، میرا ہر نفس تسبیح — اور کس کو کہتے ہیں بندگی خدا جانے
اُس کو دیکھتے ہیں وہ، اُس سے بات کرتے ہیں — جو نہ دیکھنا جانے اور نہ بولنا جانے
حُسنِ ظن ہے بے معنی، سوءِ ظن ہے لاحاصل — کیا مآلِ ہستی ہو، کیا نہ ہو، خدا جانے
جُھک گئی جبیں میری رہگذار میں اُس کی — سجدہ تھا کہ سودا تھا، اب یہ نقش پا جانے
دل نے مطمئن ہوکر، ایک بار اُسے دیکھا — پھر مرا سکونِ دل کیا ہوا خدا جانے
حُسن رنگ و نور اس میں بھر رہا ہے پیوستہ — کس قدر بھیانک تھی زندگی خدا جانے
اپنی ہی مصیبت کا کم نہیں اُسے احساس، — حُسن کیوں فسردہ ہے، عشق کی بلا جانے

میں کسی سے دُنیا میں آشنا نہیں سیماب
خود ہی جو مسافر ہو وہ کسی کو کیا جانے

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا غزل نہایت پاکیزہ ہے، لیکن کہیں کہیں تھوڑے تغیر و تبدل کی ضرورت یقیناً محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں لفظ وزن، ذوق تغزل پر ذرا گراں گزرتا ہے۔ اس کی جگہ حال بالکل سامنے کا لفظ ہے جس پر یقیناً سیماب صاحب کی نگاہ گئی ہوگی، لیکن چونکہ یہاں بے نیازی کی گرانمایگی دکھانا مقصود ہے

اس لئے یقیناً حال کا لفظ ہلکا رہتا۔ اور اسی لئے انھوں نے وزن کا لفظ استعمال کیا۔ لیکن اگر اس کی جگہ شان کا لفظ استعمال کیا جاتا تو یہ گرانی دور ہوجاتی۔

تیسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "ذمہ دارِ غم" غزل کی زبان کے منافی ہے۔ ذمہ عربی لفظ ہے جس کے معنے عہد، امان وضمیر کے ہیں۔ ذمّی کو اسی لئے ذمّی کہتے ہیں کہ اس کی حفاظت کا عہد کیا جاتا ہے۔ فارسی میں ذمہ دار کوئی نہیں لکھتا اور اگر کوئی لکھے گا تو اس کے معنے وہی ہوں گے جو ذمّی کے ہیں۔ اُردو میں عام طور پر یہ جوابدہ کے معنے میں استعمال کیا جاتا ہے جو اپنے اصلی مفہوم کے لحاظ سے درست نہیں۔ اس لئے اول تو ذمہ دار صرف نثر کا لفظ ہے اور نثر بھی وہ جس کا تعلق ادب سے نہ ہو، دوسرے یہ کہ اگر شعر میں اس کا صرف کسی جگہ ضروری ہو تو اضافت کے ساتھ نہ ہونا چاہئے۔

پانچویں شعر کے پہلے مصرعہ میں "دلنوازیاں دی ہیں" ذوق پر گراں گزرتا ہے۔ پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا: اس نے میری نظروں سے دلنوازیاں سیکھیں

دسویں شعر کے پہلے مصرعہ میں "مطمئن" کے بعد ہوکر کا استعمال سمجھ میں نہ آیا، شاعر غالباً یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ "میرا دل پُرسکون تھا، لیکن اس کو ایک بار دیکھتے ہی سکونِ دل خدا جانے کیا ہوگیا"، لیکن مطمئن ہوکر کہنے سے یہ مطلب واضح نہیں ہوتا۔

گیارھویں شعر میں لفظ پیوستہ کا استعمال درست نہیں۔ پیوستہ کے معنے دائم اور ہمیشہ کے ہیں اور یہاں مسلسل کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔

بارھویں شعر کا پہلا مصرعہ ہے: "اپنی ہی مصیبت کا کم نہیں احساس"، شاعر کہنا یہ چاہتا تھا کہ "اپنی ہی مصیبت کا احساس کم مصیبت نہیں" لیکن یہاں کم کا تعلق صرف احساس کے ساتھ ہے اور اس سے مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اپنی مصیبت کا کم احساس نہ ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ کسی اور بات کا احساس ہی نہ ہو۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ احساس خود کیا کم مصیبت ہے کہ کوئی اور مصیبت مول لیجائے تو بیشک درست ہوسکتا ہے۔

---

# ایک غلطی کی تصحیح

ستمبر کے نگار میں غالب کا جو غیر مطبوعہ قطعۂ تاریخ شایع ہوا ہے اس کے بھیجنے والے کا نام ڈاکٹر نصیرالدین علوی درج ہوگیا ہے، حالانکہ صحیح نام بشیرالدین عصری ہے۔ علاوہ اس کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں بعض الفاظ نقل سے رہ گئے تھے، اس لئے اب اس مصرعہ کو یوں پڑھا جائے۔

حکیم حاذق و دانا ہے وہ لطیف کلام

---

# مسلمانوں کا دیومالا

## (عوج بن عنق)

بُت پرستوں کے تمام مذہبوں میں دیوتاؤں کے عہد کی ایک تاریخ ہوا کرتی ہے جو بالکل خلاف فطرت اور عجیب مافوق العادت قصوں اور افسانوں سے لبریز ہوتی ہے۔ مصریوں، بابلیوں، یونانیوں، رومیوں، ہندوؤں چینیوں سب میں عہد اولین تاریخ کا ایک ایسا اور عمزو... وجود ہے جس میں یہ عجائب روزگار اشخاص جمع ہیں۔ اُس زمانہ میں آپ جسے دیکھئے عجیب و غریب شکل و شمائل۔ خارج از عقل و قوت اور انوکھی ترکیبوں اور بندشوں کا نمونہ نظر آتا ہے۔

مگر ایسے ہی دور از قیاس افسانے جب ہم آلِ ابراہیم کے موحد خدا پرستوں میں بھی دیکھتے ہیں تو بڑا تعجب معلوم ہوتا ہے۔ دراصل یہود نے غیر قوموں اور مشرکانہ عقائد کی آمیزش سے اپنی قدیم کتابوں میں ایسے بہت سے افسانے درج کر دئے ہیں جو ہندوؤں کے راون۔ یونانیوں کے ہرقلوس اور ایرانیوں کے رستم سب کو مات کر دیتے ہیں۔ مگر اس سے بھی زیادہ یہ امر قابل حیرت اور افسوسناک ہے کہ یہود کی کرتوتوں سے اخذ کر کے اکثر مسلمانوں نے بھی ایسی باتوں کو جزوِ عقاید بنا لیا۔ اُنھیں میں ایک "عوج بن عنق" ہے جس کا نام مسلمانوں میں ایسا مشہور ہوا کہ بچہ بچہ اس کو قصص الانبیا میں پڑھ کر خوش ہوتا اور سچ جانتا ہے۔ اس موقع پر نہیں ردو قدح اور تردید و تحقیق سے بحث نہیں ہم عوج بن عنق کے حالات کو پرانی عربی کتابوں سے نکال کے پیش کئے دیتے ہیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ مسلمان بھی یونانیوں اور ہندوؤں سے پیچھے نہیں، بلکہ کچھ بڑھے ہی ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ "عوج بن عنق" کی شان کا آدمی شاید دنیا کی کوئی دیومالا نہ پیش کر سکے گی۔

کہتے ہیں کہ حضرت آدم کی صلبی اولاد میں "عنق" یا "عناق" نام ایک بیٹی تھی جو ایسی بھاری بھرکم اور لمبی چوڑی تھی کہ بیٹھتی تو پوری ایک ایکڑ زمین گھیر لیتی۔ اُس کے ہاتھوں کی انگلیاں تین تین گز لمبی اور دو دو گز چوڑی تھیں (افسوس کہ اُنگلیوں کی لمبان اور چوڑان میں تناسب نہیں قایم رہ سکا) ہر اُنگلی کی نوک پر دو دو ناخن تھے جو ایسے سخت تھے کہ معلوم ہوتا فولاد کے دو دو پھاوڑے لگے ہوئے ہیں۔

دُنیا میں اسی عورت سے بدکاری و نحاشی اور رنڈی کے پیشے کی بنیاد پڑی۔ وہی جادو کی بھی موجد تھی۔ اور علانیہ گناہ کرتی تھی۔ اسی کے بطن سے عوج پیدا ہوا جو حیرت انگیز شکل و صورت کا آدمی تھا۔ عوج کی ولادت بھی حضرت آدم کی زندگی میں ہوئی۔

اس کی ماں عنق کی بے اعتدالیاں اور بدکاریاں جب حد سے گزریں تو خدا نے اُس کے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا مگر اتنی بڑی بھاری بھرکم اور ایسے قدوقامت کی عورت کا ہلاک کرنا انسان کا کام نہ تھا۔ اس لئے اُس پر بڑے بڑے شیر ببر چھوڑے گئے جو ہاتھیوں کے برابر تھے۔ بھیڑیے چھوڑے گئے جو اونٹوں کے قدوقامت کے تھے اور بڑے بڑے گدھ مسلط کئے گئے جو گدھوں کے برابر تھے۔ انھوں نے مل کے اُسے مارا۔ چیرا پھاڑا اور نوچ نوچ کر کھا گئے۔

مگر اُس کے عظیم الجثہ صاحبزادے رہ گئے جو ادھر اُدھر بے تکان مارے مارے پھرتے۔ دو قدم چلے اور مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق میں پہونچ گئے۔ سمندر اُن کا راستہ نہ روک سکتا۔ اس لئے کہ پانی کا گہراؤ کہیں بھی اُنکے گھٹنوں گھٹنوں سے زیادہ نہ تھا۔ طوفان نوح اُن کو نہ ڈبو سکا۔ اُس کا پانی فقط اُن کے ٹخنوں تک پہونچا تھا۔ کیوں نہ ہو؟ آپکا قد ماشاء اللہ سے ایک روایت کے مطابق ۳۳۳۳ ½ گز اور دوسری روایت سے جسے حسب حیثیت زیادہ معتبر ہونا چاہئے ۳۳۳۳۳ گز کا تھا۔ اور طوفان نوح میں پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے فقط چالیس ہی گز اونچا ہوا تھا۔ میاں عوج کا سر بادلوں سے اوپر نکل جاتا اور جب کبھی پیاس لگتی سر جھکا کے بدلیوں میں سے پی لیتے۔ غذا یہ تھی کہ سمندر میں اُتر جاتے اور بڑی بڑی مچھلیاں پکڑ کے ہاتھ اونچا کر دیتے، وہ دم بھر میں حرارت آفتاب سے بھن جاتیں اور آپ تناول فرماتے۔

اور حسب مضمون شملہ بمقدار علم عوج نے عمر بھی اپنے قدوقامت کی مناسبت سے پائی۔ حضرت آدم کے سامنے پیدا ہوئے تھے تین ہزار سال تک دُنیا کی بہار دیکھنے پر بھی اپنی موت سے نہیں مرے بلکہ حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے مارے گئے۔

حضرت موسیٰ سے لڑائی ہونے کا سبب یہ ہوا کہ جناب کلیم اللہ کی معرفت جب خدا نے بنی اسرائیل کو موعودہ سرزمین میں پہونچانے کا وعدہ کیا تو اُس سرزمین میں اُن دنوں کنعانی رہتے تھے جو بڑے زبردست اور جبار تھے۔ جبار سے مُراد یہ سمجھی گئی کہ وہ ہاتھ پاؤں اور قدوقامت میں بڑے تھے۔ مصر سے آزادی پانے اور فرعون کے ڈوبنے کے بعد خدا نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ مملکت شام کے علاقہ اریحا میں جاؤ۔ اس سے مراد وہی ارض مقدس تھی جس میں ہزارہا شہر تھے اور ہر شہر میں ایک ہزار آدمیوں کی آبادی تھی اور شادابی و پیداوار کی یہ حالت تھی کہ ایک ایک انگور کے خوشے کو اُن کے پانچ آدمی اُٹھا کے لے جاتے جو بمقابل ساری دنیا کے آدمیوں کے قوی ہیکل اور بڑے تن و توش کے دیوصورت لوگ تھے۔ اسی طرح انار بھی اتنے اتنے بڑے ہوتے کہ کسی انار میں سے دانے نکال لئے جاتے تو اُس کے خالی خول میں پانچ آدمی اطمینان سے بیٹھ جاتے۔ یہ عمالقہ لوگ تھے جو قوم عاد کی باقی ماندہ یادگار تھے۔ انھیں لوگوں کا ایک سردار اُن دنوں عوج بن عنق بنا ہوا تھا

اب حضرت موسیٰ کو خدا نے حکم دیا کہ اُن لوگوں سے لڑو۔ مگر مقابلے سے پہلے بارہ سبطوں میں سے بارہ شخصوں کو منتخب کر کے اُن لوگوں کے پاس بھیجو۔ جناب موسیٰ نے یہ بارہ نقیب چُن لئے۔ اور جب ارض اریحا کی سرحد پر پہونچے تو اُن بارہ نقیبوں کو روانہ کیا کہ جبارین اریحا کی حالت دریافت کر لائیں۔ یہ اسرائیلی نقیب جیسے ہی سرزمین اریحا میں داخل ہوئے عوج بن عنق کا سامنا ہو گیا۔ عوج سر پر لکڑیوں کا ایک گٹھا لئے ہوئے تھا۔ ان بارھوں اسرائیلیوں کو بھی اُسی گٹھے پر بٹھا لیا اور گٹھے کو گھر میں جورو کے پاس لیجا کر اُن کو زمین پر ڈال کے کہا "ذرا ان ننھے منّے آدمیوں کو دیکھنا۔ یہ ہم سے لڑنے کو آئے ہیں۔ خیر اب تو میں ان کو دم بھر میں پیس کے رکھ دوں گا"۔ جورو کہنے لگی "ان کے مار ڈالنے سے کیا ملیگا؟ ان کو چھوڑ دو کہ اپنی قوم سے جا کے ہماری قوت اور ہمارے قدوقامت کا تذکرہ کریں اور جو کچھ دیکھا ہے کہہ سنائیں"۔ جورو کے

کہنے سے عوج نے ان اسرائیلیوں کو چھوڑ کے اپنے یہاں سے ہنکا دیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ عوج نے لکڑیوں کے گٹھے میں نہیں بلکہ اپنی آستین میں جو اُن دنوں جیب کا کام دیا کرتی تھی باغ کے میووں کے ساتھ ان بارہ اسرائیلی نقیبوں کو بھی بھر لیا۔ اور بادشاہ کے سامنے لاکے آستین جھاڑ دی تو پھلوں اور میووں کے ساتھ بارہ آدمی بھی نکل پڑے بادشاہ پہچان گیا کہ اسرائیلی ہیں۔ اُن سے کہا "جاؤ اور اپنی قوم سے یہی بیان کر دینا جو تم نے دیکھا ہے"۔

ان اسرائیلیوں کے چلے آنے کے بعد عوج نے ایک بڑا بھاری پہاڑ اُکھاڑ کے اپنے سر پر رکھ لیا۔ جو پھیلاؤ میں اتنا ہی بڑا تھا جتنی وہ زمین تھی جس پر حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کا پڑاؤ تھا۔ یعنی ساڑھے تین میل لمبی اور اُتنی ہی چوڑی تھی۔ اس چٹان کو لیکر چلا تاکہ بنی اسرائیل کی لشکر گاہ پر ڈال کے اُنھیں ہمیشہ کے لئے فنا کر دے کہ اتنے میں ایک ہُدہُد اُس چٹان پر آ بیٹھا اور اُس کو ایک چونچ جو ماری تو وہ چٹان بیچ سے خالی ہو کر عوج کے گلے کا ہار ہو گئی۔ سارا سر اُس کے اندر سما گیا اور کسی چیز کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ اتنے میں وہ ٹھوکر کھا کے گرا۔ اسی مصیبت میں تھا کہ جناب کلیم اللہ موسیٰ آ پہونچے اور اپنی حربہ کا ایک ایسا معجز نما ہاتھ مارا کہ ایک ہی ضرب میں اُس کا دم نکل گیا۔

راوی کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ کا قد چالیس گز کا تھا۔ چالیس ہی گز کی اُن کی حربہ لمبی تھی اور حملہ کرتے وقت اُنھوں نے چالیس ہی گز اونچی جست کی۔ اس طرح ۱۲۰ گز کی بلندی پر لکڑی ماری تو عوج کی ایڑی میں لگی اور وہی اُس کی موت کا بہانہ ہو گئی۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کے ایک انبوہ کثیر نے خنجر مار مار کے بڑی مشکلوں سے عوج کا سر دھڑ سے جدا کیا اور اُسکی ایک پسلی لیجا کے دریائے نیل پر ڈال دی جس سے پُل بن گیا۔ اور لوگ اُسی پر سے ہو کے نیل کے پار ہوا کرتے تھے۔ ہمارے بچپن میں بہت سے صادق العقیدہ مسلمانوں کو یقین کامل تھا اور شاید آج بھی ہو کہ دریائے نیل پر آج تک عوج بن عنق کی پنڈلی کی پونگ کا پُل قایم ہے۔ جس میں اگر ذرا بھی کوئی شک کرتا تو لوگ لڑنے اور اُسے بے دین کہنے کو طیار ہو جاتے۔ مگر اب کتب سلف سے معلوم ہوا کہ پونگ نہیں پسلی کا پُل قایم تھا اور خدا جانے آج بھی ہے یا نہیں۔

قتل کے بعد حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل اُس کی لاش کو چھوڑ کے چلے گئے: اس لئے کہ اتنی بڑی لاش کے لئے قبر کون کھودتا؟ اور کس کے دفن کئے دفن ہوتی؟ مگر چند ہی روز بعد لاش پر اتنی بالو اور مٹی جمع ہو گئی کہ ایک سلسلہ کوہ بن گیا۔ اور کیا عجب کہ وہ پہاڑ آج بھی موجود ہو۔ مگر افسوس جغرافیہ نویسوں کو پتہ نہ لگا کہ وہ پہاڑ کون سا ہے اور کہاں ہے؟

خلاصہ یہ کہ میاں عوج بن عنق دُنیا کی تاریخ میں بڑے شخص تھے۔ اور صحیح معنوں میں بڑے تھے۔

(افادات شرر لکھنوی)

---


## نگار ۴۳ء اور ۴۴ء کے یہ پرچے موجود ہیں

۴۳ء : اپریل ء۔ مئی ء۔ جون ء۔ اگست ء۔ ستمبر ء۔ اکتوبر ء۔ نومبر ء۔ دسمبر ء

۴۴ء : اپریل ء۔ مئی ء۔ جون ء۔ جولائی ء۔ اگست ء۔ ستمبر ء۔ اکتوبر ء۔ منیجر نگار

# باب الاستفسار

## ہندو مسلمان کیا ایک ہی قوم ہیں

(جناب شمیم رضوی - گیا)

مسٹر جناح کا یہ فرمانا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں کیا درست نہیں ہے - مسلمانوں کا مذہب ایمان تاریخ تمدن، فلسفہ، تصوف، زبان، ادب، معاشرت طرز رہائش، رسم و رواج، قانون وغیرہم ہندوؤں سے جب بالکل جداگانہ ہیں تو کیا مسلمانوں کی قومیت جداگانہ نہیں ہے؟ ہندوؤں کی نظروں میں مسلمان اچھوت ہوں - ان کے سائے سے پانی ناپاک ہو اُردو بدیسی زبان ہو، مسلمانوں کی روزی چھیننا اُنھیں روٹی سے محروم کر دینا دھرم ہو، بلوہ کرنا مسلمانوں کا توشنا پن کا کام ہو۔ ان تلخ حقیقتوں کے باوجود بھی گاندھی جی کا ڈنکے کی چوٹ کہنا کہ ہندو اور مسلم دو جداگانہ قوم نہیں ہیں کہاں تک صحیح ہے؟ آپ نے اپنے ملاحظات میں مسلم لیگ کے مطالبات کو ہمیشہ (Communal) قرار دیا ہے۔ اگر آپ بہار آئیں اور ہندوؤں کی تنگ نظری، تعصب، مسلم دشمنی و ایذا رسانی کا سنجیدگی سے ملاحظہ کریں تو مجھے یقین کامل ہے کہ آپ اپنے "ملاحظات" کا رنگ بدل دیں گے اور مسلمانوں کے جایز مطالبات کی آپ خود ہی پُرزور تائید و سفارش کریں گے۔ افسوس تو یہی ہے کہ "پریس" ہندوؤں کے قبضہ و اختیار میں ہونے سے آپ کو مسلمانوں کے متعلق سچی اور حقیقی خبریں نہیں ملتی ہیں۔ تاہم (Nation Theory) کے متعلق آپ کا خیال کیا ہے؟ آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

---

(نگار) ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانوں کی قومیت کا مسئلہ پہلے تو نہیں لیکن اب یقیناً کافی غور طلب بات ہو گئی ہے - پہلے ان دونوں کے تعلقات اس قدر خوشگوار تھے کہ نہ مسلمان کی نگاہ ہندوؤں کی بُت پرستی پر جاتی تھی اور نہ ہندوؤں کی مسلمانوں کی گاؤکشی پر - آپس میں برادرانہ تعلقات قایم تھے اور ایک دوسرے سے اپنوں کی طرح ملتے تھے لیکن اب یہ بات نہیں ہے اور دونوں کے تعلقات واقعی بہت خراب ہو گئے ہیں -

اس باب میں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ دونوں کے تعلقات میں یہ تبدیلی کیوں ہوئی - اس کا بڑا سبب حکومت کی پالیسی کو قرار دیا جاتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر حکومت ایسا چاہتی بھی تھی تو ہم کیوں اس سے متاثر ہوئے

اس سلسلہ میں جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ حکومت کی اس پالیسی کا اثر سب سے پہلے ہندوؤں نے قبول کیا تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا تعلق حکومت کی پالیسی سے اتنا نہیں ہے، جتنا خود ہندوؤں کے احساس آزادی سے جو نتیجہ تھا مغربی تعلیم کا۔ مسلمانوں میں یہ احساس بہت دیر میں پیدا ہوا جس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی حکومت کے زوال کے بعد بھی عرصہ تک سلطنت کا خواب دیکھتے رہے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندو واقعی مسلمانوں سے مرعوب بھی تھے۔

ہندوؤں کے احساس آزادی میں چونکہ خالص وطنی جذبہ کام کر رہا تھا اور مسلمان ہمیشہ اپنے آپ کو غیر ملکی سمجھ کر عرب و عجم، افغانستان و ایران کے ساتھ اظہار نسبت پر فخر کیا کرتے تھے (جیسا کہ ان کے ناموں کے ساتھ ہاشمی، فاروقی صدیقی، چغتائی، صفوی وغیرہ کی نسبت سے ظاہر ہوتا ہے) اس لئے قدرتاً ہندوؤں کے اس جذبۂ آزادی کا محاذ نہ صرف انگریزوں بلکہ ان تمام قوموں کے خلاف قایم ہونا تھا، جنھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن نہ قرار دیا تھا۔

یہ درست ہے کہ بعد کو مسلمانوں میں بھی احساس آزادی پیدا ہوا اور اپنے آپ کو انھوں نے ہندوستانی کہنا شروع کیا، لیکن چونکہ ان کا یہ احساس وطنیت اتنا قوی نہ تھا کہ ان کے عمل سے پوری طرح اس کا اظہار ہوتا، علاوہ بریں ان دونوں قوموں کا اختلافِ ثقافت (کلچر) بھی بہت نمایاں تھا، اس لئے ہندو مشکل سے یقین کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کا احساس وطنیت واقعی اسی قسم کا احساس ہے جو ہندوؤں میں پایا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کانگرس میں مسلمانوں نے بھی نمایاں حصہ لیا اور جمعیۃ العلماء کی شرکت نے تو عام مسلم آبادی میں اس احساس آزادی کو بہت تیز کر دیا، لیکن ہندو سمجھتے تھے (اور ان کا یہ سمجھنا غلط نہ تھا) کہ اس احساس میں ملک و وطن کی خدمت یا ہندوؤں کی رفاقت کا جذبہ اتنا قوی نہ تھا، جتنا انگریزوں کی مخالفت کا اور اس طرح گویا ہندو مسلمانوں کا یہ اتفاق دو دوستوں کا سا نہ تھا، بلکہ ایک مشترک دشمن کے خلاف دو جماعتوں کا اتحاد تھا۔

ہندو اس سے قبل خلافت اور خدام کعبہ وغیرہ قسم کی تحریکوں کو دیکھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ مسلمانوں کی شرکت کانگرس بھی ان کا وہ ناآسودہ جذبہ ہے جو ان کی مذہبی یا نیم مذہبی تحریکوں میں کام کر رہا تھا اور اگر آیندہ کبھی ان کو یہ موقعہ لگیا کہ وہ ہندوؤں سے کٹ کر اپنی مذہبی یا سیاسی حیثیت علٰحدہ قایم کر سکے تو کبھی اس سے باز نہ آئیں گے اور جس کا بڑا ثبوت انھیں پاکستان تحریک سے ملگیا۔

ہندوؤں کو یہ اندیشہ مسلمانوں کی طرف سے اسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب وہ کانگرس میں شامل ہوئے تھے، کیونکہ سوائے چند کے مسلمانوں کے اکابر نے اپنی ثقافت میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی اور ایک تحت شعوری کیفیت مذہبی و نسلی تفوق کی ان میں بدستور پائی جاتی تھی، جو گاؤکشی اور اذان و ناقوس کے مسایل میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہتی تھی، اسی کے ساتھ ہندوؤں نے یہ بھی محسوس کیا کہ جس وقت کوئی بنیادی تحریک آزادی ملک کی سامنے آتی ہے تو اس میں عملاً مسلمان نہ صرف یہ کہ عملاً کم شرکت کرتے ہیں بلکہ اس میں موانع پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اس سلسلہ میں سب سے بڑی چیز مخلوط انتخاب اور مخلوط رائے دہندی کا مسئلہ تھا، جس کی مخالفت کر کے مسلمانوں نے ہندوؤں کو ہمیشہ کے لئے اپنے آپ سے جدا کر دیا۔

یہاں تک کہ رفتہ رفتہ جب مسلم لیگ نے اپنا محاذ الگ قایم کرلیا اور بعد کو صوبہ جاتی آزادی کے سلسلہ میں اکثریت و اقلیت کے معیار پر آزادی کا سودا شروع ہوا، تو ہندؤں نے فیصلہ کرلیا کہ انھیں اب مسلمانوں سے کٹکر ہی اپنے ہاتھ مضبوط کرنا ہے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ ہوسکتی تھی، چنانچہ ان کی عصبیت برابر بڑھتی رہی اور وہ تمام باتیں سامنے آئیں جن کا تجربہ آپ کو صوبۂ بہار میں اور ہم لوگوں کو یو۔پی میں ہوا اور ہو رہا ہے۔

یہ درست ہے کہ بیجا عصبیت کے لئے دنیا میں کوئی دلیل پیش نہیں کیجا سکتی، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اگر کوئی قوم اپنی کمزوری کی بنا پر عصبیت کا شکار بنی ہوئی ہے تو اسے شکایت کا بھی کوئی حق حاصل نہیں خاصکر ایسی صورت میں جبکہ دوسری جماعت میں یہ جذبۂ عصبیت خود انھیں کی حماقتوں نے پیدا کیا ہو۔

میں کیا ہر شخص تسلیم کرے گا کہ ہندو مسلمان دونوں یقیناً دو قوم ہیں ——— کیونکہ قومیت کی بنیاد مذہب و کلچر پر قایم ہوتی ہے اور مسلمان ان دونوں باتوں میں ہندؤں سے بالکل مختلف ہیں۔ لیکن یہ بات کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ دو قوموں کا مذہبی و ثقافتی اختلاف ملکی سیاست کو کیوں متاثر کرے۔ ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں بھی مختلف قومیں بستی ہیں لیکن جس حد تک سیاست و ملکی اغراض کا تعلق ہے، ان میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ ہندوستان میں ایسا کیوں ہے ؟

میں نے اس مسئلہ پر جہاں تک غور کیا ہے، اس نزاع کا سبب مجھے صرف مذہب نظر آیا۔ ہر چند بظاہر یہ بہت عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ مذہب جس کا مقصود ہی امن و صلح قایم کرنا ہے، وہی امن شکنی کا باعث ہو، لیکن نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہر جگہ جب مذہب کی صحیح روح ختم ہوئی، ہمیشہ اسی قسم کے اختلافات رونما ہوئے۔ اور چونکہ اس وقت جہل کی وجہ سے ہندوستان ہی سب سے زیادہ بدمذہبی (لامذہبی نہیں) کا شکار ہے اسلئے یہاں یہ ناگوار صورتیں پیدا ہی ہونا چاہئے، اور اگر ناگوار نہ ہو تو اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کروں کہ اس کے ذمہ دار زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔

یہ درست ہے کہ بعض ہستیاں مسلمانوں میں ایسی بھی رونما ہوئیں، جنھوں نے ان اختلافات کے دور کرنے کی کوشش کی، لیکن اس میں کامیابی نہ ہوسکی۔ مذہبی اختلافات کی بنا پر قومی افتراق دور کرنے کی صورت صرف ایک ہی ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ مذہبی زواید کو دور کردیں اور رواداری سے کام لیں اور چونکہ ہندؤں سے زیادہ مسلمانوں کو اس پر غور کرنے کی ضرورت تھی، اس لئے میں زیادہ تر انھیں کو قابل الزام قرار دیتا ہوں۔

جس وقت ہم ان کو باہمی خونریزی کے اسباب نظر ڈالتے ہیں، تو ہم کو اس کے صرف دو سبب نظر آتے ہیں ایک گائے کی قربانی، دوسرے نماز و اذان کے وقت ہندؤں کا ناقوس بجانا اور جلوس وغیرہ نکالنا۔ اور یہ دونوں باتیں ایسی نہ تھیں کہ مسلمان اپنے مذہب کو صدمہ پہونچائے بغیر رواداری و مسالمت سے کام نہ لے سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان گائے کی قربانی ترک کردیتے تو بھی وہ بدستور مسلمان رہ سکتے تھے، لیکن اس کا کیا علاج کہ

مسلمان اس صورت میں ترک قربانی کو ترک مذہب قرار دیتا ہے، جو میرے نزدیک بدمذہبی کی محبوب ترین مثال ہے اور اسی لئے میں اس باب میں مسلمانوں کو ذمہ دار قرار دیتا ہوں۔

اگر مسلمانوں کی طرف سے اس رواداری کا اظہار ہوتا تو اذان و ناقوس کے مسئلہ میں یقیناً ہندو بھی رواداری سے کام لیتے اور وہ کبھی مسلمانوں کو کسی شکایت کا موقعہ نہ دیتے، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم مان لیں کہ ہندو اس مسئلہ میں رواداری نہ برتتے، تو بھی کوئی حرج نہ تھا۔ اذان کے وقت ناقوس کا بجایا جانا یا مسجد کے قریب سے کسی جلوس کا نکلنا ایسی بات نہیں جس سے مسلمانوں کے مذہب کو (جس کی مضبوطی کا انھیں اتنا بڑا دعویٰ ہے) صدمہ پہونچتا — اگر وہ ان صورتوں میں بھی ضبط سے کام لیتے تو یہ ان کا اظہار کمزوری نہ ہوتا بلکہ اس عظیم المرتبت سنجیدگی کا اظہار ہوتا جس کی تعلیم قرآن نے ان بے نظیر الفاظ میں دی ہے کہ "اذا مرّوا باللغو مرّوا کراما"

بہرحال ہندوستان کی سیاسی پیچیدگیوں کا واحد سبب میرے نزدیک یہاں کی بدمذہبی ہے اور چونکہ یہ چیز ہندوستان کے مسلمانوں میں اب پیدا ہوئی ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ قصور زیادہ تر انھیں کا ہے۔ ہندوستان سے باہر کے مسلمان بھی مذہب سے بہت کچھ ہٹ گئے ہیں، لیکن وہ مذہب سے ہٹ کر لامذہب ہوئے ہیں بدمذہب نہیں ہوئے اور لامذہبیت، بدمذہبیت سے بدرجہا بہتر ہے۔

الغرض ہندو مسلمان اگر دو قوم ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے، تو اس کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر عاید ہوتی ہے نہ کہ ہندوؤں پر اور انھیں کو اس کا علاج سوچنا چاہیئے۔

آپ کہتے ہیں کہ اس کا علاج پاکستان ہے اور میرے نزدیک آپ کی تشخیص و تجویز دونوں غلط ہیں۔ کیونکہ اول تو پاکستان کا خواب جس طرح مسٹر جینا نے پیش کیا ہے شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا، کیونکہ اس میں جو اقتصادی سیاسی و ملکی پیچیدگیاں پیدا ہونے والی ہیں ان کا علاج ممکن نہیں اور اگر ہو بھی تو اس کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی غیر ملکی حکومت پاکستان کے بقا کی ضامن ہو اور اسی لئے مسٹر جینا بار بار انگریزوں کا دامن پکڑنا چاہتے ہیں۔ ہاں، اگر صوبۂ سرحد، پنجاب، سندھ ہندوستان سے بالکل کٹ کر، بہ معیت افغانستان و ایران، سوویٹ یونین میں شامل ہو کر اپنی وحدتیں الگ الگ قایم کر سکیں تو بے شک کوئی صورت کامیابی کی پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس کا کوئی امکان نہیں۔

علاوہ اس کے اگر پاکستان قایم ہو جائے تو بھی وہاں کے مسلمانوں میں کوئی اتفاق و اتحاد پیدا ہوتا نظر نہیں آتا، کیونکہ پاکستان میں فرمہبیت زیادہ قوی ہو جائے گی اور خود مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں جو نزاع چلی آرہی ہے وہ زیادہ بڑھ جائے گی اور اس طرح جس امن و سکون کے لئے آپ بیتاب ہیں وہ پاکستان میں بھی نہ ملے گا۔ علاوہ اس کے اگر پاکستان، مسلمانوں کی ۹ کرور آبادی میں سے صرف تین کرور کو پناہ دینے کے بعد باقی ۶ - ۷ کرور کو اور زیادہ اُلجھنوں میں مبتلا کر دے، جس کا یقین ہے تو یہ نہ مسلمانوں کی خدمت ہوگی نہ اسلام کی، بلکہ صرف ان صوبوں کے مسلمانوں، کی جہاں اب بھی وہ اکثریت میں ہیں اور اپنا اثر رکھتے ہیں — ضرورت تو ان صوبوں کے حالات سدھارنے کی ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جن کو نا پاکستان ہی

میں زندگی بسر کرتا ہے۔

اخیر میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب پاکستان صحیح تدبیر نہیں، تو پھر مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اس کے متعلق میری ذاتی رائے وہی ہے جو اس سے قبل بارہا ظاہر کر چکا ہوں، کہ جب تک ہم ان کی اقتصادی و تعلیمی حالت درست نہ کریں گے، یہ کبھی نہیں اُبھر سکتے، خواہ بجائے پاکستان کے فردوس ہی کیوں نہ ان کے لئے اُتر آئے۔

قرآن میں مسلمانوں کے لئے جن جنات عدن کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا تعلق ان کی اقتصادی خوشحالی ہی سے ہے، لیکن یہ بات نہ ہمارے رہنماؤں کی سمجھ میں کبھی آئے گی اور نہ ہم سنبھل سکیں گے۔

میں تو مسلمانوں کی طرف سے بہت مایوس ہو چکا ہوں اور میرے سامنے ان کا مستقبل یہاں وہی ہے جو اسپین میں دیکھا گیا تھا۔ اور اس پر حیرت کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ اس سے قبل دُنیا میں کیسی کیسی زبردست قومیں اُبھریں اور آخر کار اپنے عادات و اطوار کی خرابی ہی کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ پھر مسلمانوں میں کیا خصوصیت ہے کہ قدرت اپنا قانون ان کے لئے بدلدے گی۔ اگر ان کی بے حسی و بیراہ روی کا یہی عالم ہے اور اگر انکی بدمذہبی اسی طرح قائم رہی تو انھیں تباہ ہونا ہے اور ہونا چاہئے۔

# بعض دلچسپ معلومات

شادیوں کی تاریخ میں، ۳۲۴ء قبل مسیح کا وہ دن ہمیشہ یادگار رہے گا جب سکندر اعظم نے اپنے دس ہزار مقدونیا کے سپاہیوں کی شادی بیک وقت ایران کی دس ہزار عورتوں سے کی۔

مغرب کا مشہور ناول نگار چارلس ڈکنس، جہاں جاتا تھا اپنے ساتھ قطب نما ضرور لیجاتا تھا، تاکہ ٹھیک قطب شمالی کی طرف اپنے بستر کا سرہانا رکھ سکے۔ اسکو نہایت قوی اعتقاد تھا کہ شمال کی طرف سر رکھکر سونے سے برقی رَو سر سے پاؤں تک دوڑتی رہتی ہے۔

۲۹ء میں صرف ۹۵۵، اخبار روس میں شایع ہوتے تھے، ۳۴ء میں ان کی تعداد ۹۷۰۰ تک پہنچ گئی اور اشاعت سوا کرور سے ساڑھے تین کرور ہو گئی۔ پچھلی لڑائی سے قبل روسی اخباروں کا ۱/۵ حصہ ماسکو اور لینن گراڈ سے شایع ہوتا تھا، لیکن اب ملک کے ہر بڑے چھوٹے شہر سے اخبارات شایع ہوتے ہیں۔

سمندر کی جغرافی تعریف جو کچھ بھی ہو، لیکن اس کی تازہ ترین سیاسی تعریف یہ ہے کہ "وہ پانی کا ایسا حصہ ہے جس کے چاروں طرف خطرہ ہی خطرہ ہو"

دُنیا کی سب سے بڑی وادی افریقہ میں ہے۔ اسکا نام (Great Rift) ہے، اسکی وسعت پانچ ہزار میل ہے۔

لاسلکی کی ترقیوں کے سلسلہ میں نشر اصوات کی ایک صورت یہ بھی سامنے ہے کہ معمولی برقی قمقموں کی مدد سے ہر شخص اپنے گھر میں گانے اور تقریریں سُن سکے۔ اس روشنی کا نام "متکلم روشنی" ہوگا۔

# باب المراسلۃ والمناظرہ

## (توفیق حسن خاں - شاہجہانپور)

محترمی ، السلام علیکم !

ستمبر ۱۹۴۴ء کے نگار میں طلبہ کے غور و فکر کے لئے جغرافیہ کے جو تین سوال[1] آپ نے درج کئے ہیں انکا جواب روانہ کر رہا ہوں، امید ہے کہ آپ بذریعہ نگار اپنی رائے سے مطلع فرمائیں گے۔

---

۱۸۷۵ء میں لوتھین گرین (Lowthian Green) نے اس عقیدہ کی بنا پر کہ قطب شمالی کی طرف کا حصۂ زمین (NORTH Polar Region) اپنی ہیئت و شکل میں قطب جنوبی (South Polar region) کے حصۂ زمین سے مختلف ہے یہ بتایا تھا کہ اس کی ہیئت کچھ ایسی ہے جیسے لٹو نما چیز پر دباؤ پڑے اور وہ درمیان میں کچھ پچک جائے۔

اس سے پہلے سائنٹنگ فربیرن (Citing Fairbairn) تجربہ کر چکا ہوں کہ کانچ کی کھوکھلی نلکیوں کو اگر ٹھنڈا کیا جائے تو وہ اپنی متقاطعی تراش (Cross section) میں مثلث نما شکل اختیار کر لیتی ہیں (ملاحظہ ہوں اشکال نمبر ۱، ۲، ۳) اس لئے لوتھین گرین اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر کوئی لٹو نما چیز انھیں حالات سے گزرے تو وہ (Tetra hedron) یعنی چار مساوی مثلث نما شکل رکھنے والی چیز کی طرح بن جائیگی (ملاحظہ ہوں اشکال نمبر ۴، ۵)

لیلمان (Lalle mand) کا بھی یہ تجربہ کہ اگر کسی ربر کی گیند میں بھری ہوئی ہوا کو آہستہ آہستہ

---

[1] سوالات یہ تھے:- ۱ - آپ دنیا کے نقشہ کو اٹھا کر دیکھئے - اس میں آپ کو چند خاص باتیں نظر آئیں گی ایک یہ کہ جتنے جزیرہ نما یا ملک اس میں پائے جاتے ہیں مثلاً ہندوستان، امریکہ یا افریقہ وہ سب لمبوترے سے ہیں اور اُن کا پتلا یا نکیلا حصہ جنوب کی طرف ہے۔

۲ - دوسری بات یہ کہ کرۂ زمین کے نصف شمالی حصہ میں زمین کا حصہ زیادہ ہے اور دوسری نصف (جنوبی) حصہ میں پانی کی مقدار زیادہ ہے۔

۳ - تیسری بات یہ کہ شمالی نصف حصہ میں جہاں جہاں خشکی پائی جاتی ہے اس کے بالکل مقابل جنوبی نصف حصہ میں پانی پایا جاتا ہے البتہ صرف شمالی چین کا کچھ حصہ ایسا ہے جو جنوبی امریکہ کے ایک حصہ کے مقابل پڑے گا، ورنہ باقی ہر جگہ آپ کو خشکی کے مقابلہ میں پانی ہی نظر آئے گا - ایسا کیوں ہے؟

نکالا جائے تو وہ ذوار بعۃ السطوح (Tetrahedron) شکل کی ہو جاتی ہے گرین کے نظریہ کی تائید کرتا ہو
(Tetrahedron) کو اس طرح بنایا جا سکتا ہے کہ کسی دفتی سے چار مساوی مثلث کاٹ لئے جائیں
اور ان کے کناروں کو چپکا دیا جائے اس طرح کہ ایک لٹو کی شکل بن جائے (ملاحظہ ہو شکل نمبر ۶) اب اگر اس کا معائنہ
کیا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ اُس کی چار نوکوں میں سے ایک نوک نیچے کی جانب ہے اور باقی تین اوپر کی طرف۔ اسی طرح
اُس کے چار مثلثوں کے "وسطی نقطوں" میں سے ایک اوپر کی طرف ہے اور تین نیچے کی جانب۔ اوپر کے نقطہ کو قطب شمالی
(North pole) اور نیچے کی نوک کو قطب جنوبی South pole کہا جا سکتا ہے (جیسا کہ شکل نمبر ۷
سے ظاہر ہے) یہ نوکیں مرکز کشش سے سب سے زیادہ فاصلہ پر ہوں گی اور یہ نقطے مرکز کشش سے سب سے زیادہ
قریب۔ اس کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر اس Tetrahedron کے اندر بالکل چوکس طریقہ پر ایک گولہ
(کرۂ کشش) رکھا جائے تو اس کی سطح کا لمس صرف ان ہی چار "نقطوں" پر ہو گا اور ان نقطوں کے گرد کی سطح جسقدر
ان سے دور ہوتی جائے گی گولہ سے بھی اس کا فاصلہ بڑھتا جائے گا اور کسی سطح کا مرکز کشش سے دور ہونے کا مطلب
یہ ہوا کہ وہ سطح بہ نسبت اس سطح کے جو مرکز کشش سے قریب ہے اونچائی پر ہے۔ اگر اسی سطح پر پانی ٹھہرایا جائے تو وہ
قدرتاً نشیب یعنی نقطوں کی جانب بہے گا۔ چونکہ ان نقطوں میں سے تین نقطے Tetrahedron کے نصف
جنوبی حصہ میں ہیں (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے) اس لئے وہاں پانی کی مقدار زیادہ ہے اور نوکوں میں سے تین نوکیں
Tetrahedron کے نصف شمالی حصہ میں ہیں اس لئے وہاں زمین کا حصہ زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ کرۂ ارض کے
نصف (جنوبی) حصہ میں پانی کی مقدار زیادہ ہے اور دوسرے نصف (شمالی) حصہ میں زمین کا حصہ زیادہ ہے۔
شکل نمبر (۷) کو دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ نیچے کی "نوک" (قطب جنوبی) سے مثلثوں کے تین اتصالی خطوط
(ب ا، ب د، ب ج) نکل کر اوپر کی جانب (یعنی قطب شمالی کو) گئے ہیں۔ ان ڈھلواں اتصالی خطوط کو ہم
"پشتے" (ridges) کہہ سکتے ہیں۔ ان میں سے پہلا پشتہ (ب ا) افریقی پشتہ دوسرا (ب د) جنوبی اور
شمالی امریکی پشتہ اور تیسرا (ب ج) آسٹریلیائی و سماتری پشتہ ہے۔ جنوب میں ان پشتوں کا سلسلہ جا بجا سطح آب
سے نیچے ہونے کے سبب خطۂ قطب جنوبی (South polar region) سے منقطع ہو گیا ہے۔ اس سے
یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان پشتوں کا ڈھال مشرق اور مغرب کے علاوہ جنوب کو بھی ہے۔ اگر ہم اسی طرح کاغذ کے ایک
لمبے ٹکڑے کو کسی زاویہ پر موڑ کر پشتہ نما شکل کا بنائیں اور اس کو پانی میں ترچھا کر کے ڈبوئیں (جیسا کہ شکل نمبر (۸)
میں دکھایا گیا ہے) تو اسے باہر نکالنے پر ہم دیکھیں گے کہ اس پر پانی کا نشان "V" شکل کا ہو گا (شکل نمبر (۹)
ملاحظہ ہو)۔ بعینہٖ براعظموں کی حالت ہے کہ وہ شمال کی جانب پھیلے ہوئے اور جنوب کی جانب نکیلے یا
لمبوترے ہیں۔

تیسری بات جو Tetrahedron کے معائنہ سے معلوم ہو گی وہ یہ ہے کہ اُس کی ہر ہموار سطح
کے بالکل مقابل دوسرے حصہ میں ایک نوک ہے اور چونکہ "سطح" مرکز کشش سے نزدیک ہونے کے باعث
نشیبی حصہ اور "نوک" مرکز کشش سے دور ہونے کے سبب اونچا ثابت کئے جا چکے ہیں لہٰذا ہماری زمین میں

یہ بلند حصے زمین کے قطعات کی جگہ پر ہیں اور نشیبی حصے سمندری جگہوں پر۔ اس طرح یورپ، افریقہ اور ایشیا کے کافی حصہ کے بالکل مقابل دوسرے نصف (جنوبی) حصہ میں بحرالکاہل (Pacific ocean) شمالی امریکہ کے مقابل بحرہند (Indian ocean) آسٹریلیا اور مشرقی ایشیا کے کچھ حصہ کے مقابل بحراوقیانوس (Atlantic ocean) اور خط قطب جنوبی کے مقابل بحر شمالی (Arctic ocean) واقع ہیں۔

شکل نمبر ۱ و ۲ و ۳ — کانچ کی نلکیاں ٹھنڈی ہونے پر اپنی (متقاطعی تراش) میں

شکل نمبر ۴ و ۵ و ۶ — لٹو نما چیز ٹھنڈی ہونے پر

شکل نمبر (۶) — Tetrahedron (ذوار بعۃ السطوح)

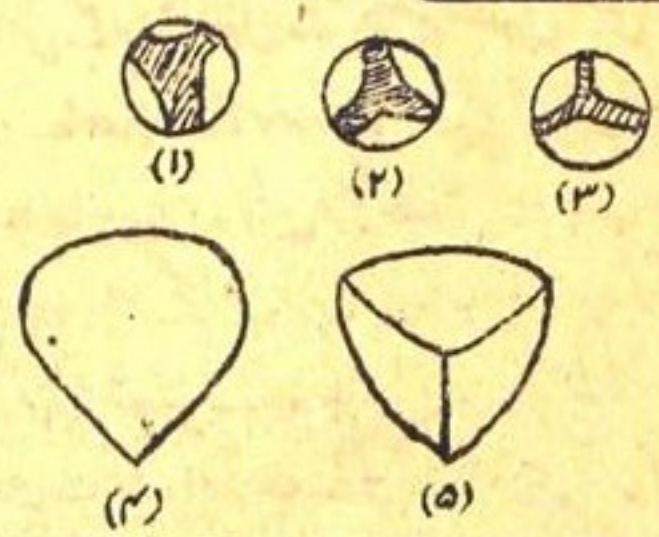


شکل نمبر ۷ (Tetrahedron)

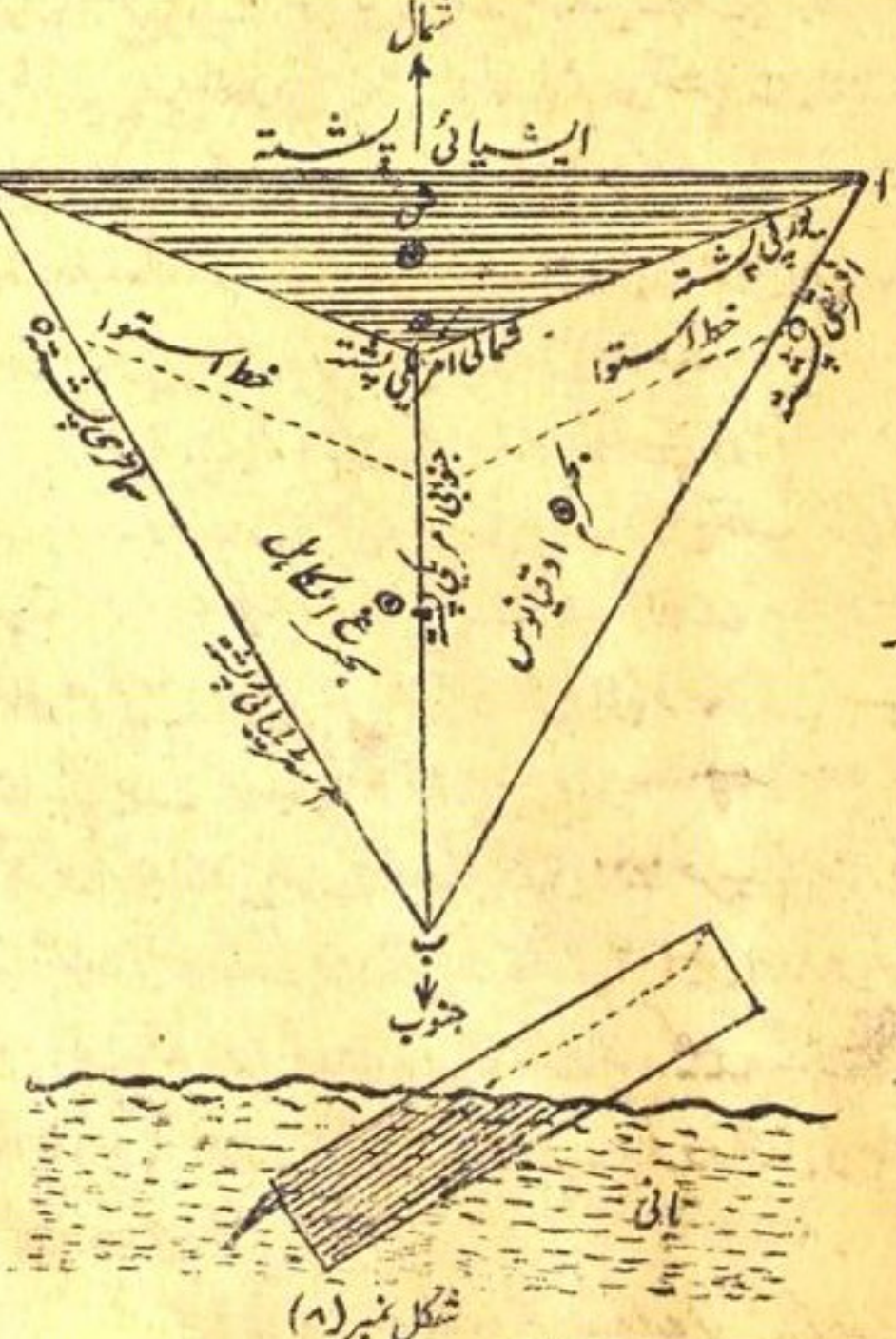


شکل نمبر (۸)

شکل نمبر (۸) کسی زاویہ پر مڑا ہوا کاغذ ترچھی صورت میں پانی کے اندر۔

شکل نمبر (۹) کاغذ پانی سے باہر نکالنے کے بعد۔

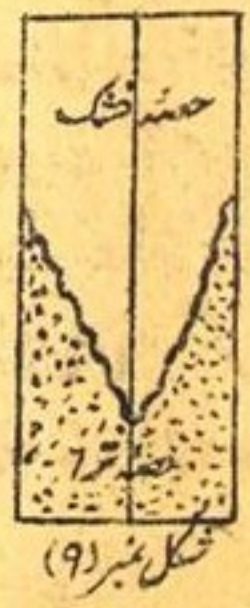


شکل نمبر (۹)

(نگار) آپ کا جواب بالکل صحیح ہے اور آپ کی تحریر کے موافق نگار ایک سال کے لئے شاہجہانپور کی اس لائبریری کے نام جاری کر دیا گیا ہے، جس کی آپ نے سفارش کی تھی۔

# مکتوبات نیاز

بندہ نواز - غالب کا فتویٰ یہ ہے کہ "جو غم کی تاب نہ لاسکے وہ رازداں نہیں بن سکتا"، لیکن میں تو شاید ایسا نہیں ہوں - پھر یہ احتیاط کیوں ؟ —— غالباً اس لئے کہ غم کی تاب لانا شریک غم ہونا تو نہیں ؟ لیکن آپ کو اس کی ضرورت ہی کیا ہے !

آپ تو - "ہمیں میداں، ہمیں چوگاں، ہمیں گوئے" قسم کے انسان ہیں "قضیۂ زمین برسرِ زمین" طے کرنے والے —— یہ فکر تو وہ کرے جو فردا کا غم پالے - نہ کہ آپ جن کی زندگی نام ہے صرف آج کا !-

میں نتیجہ کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں، لیکن نتیجہ سے پہلے جو کچھ ہوا یا ہونے والا ہے، اس کا حال ضرور سننا چاہتا ہوں —— صرف لطف کے لئے اور اجازت ہو تو آپ کو داد دینے کے لئے بھی !

---

تم بسا اوقات اتنا پریشان کر دیتے ہو کہ بے اختیار اپنا منہ پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے — ایک بار نہیں ہزار بار لکھ چکا ہوں کہ تمہاری خواہش پوری کرنا میرے امکان سے باہر ہے، لیکن تم اسے بہانہ سمجھتے ہو — یہ تم سے کس نے کہدیا کہ وہ میری بات ٹال نہیں سکتے - اور اگر ایسا ہو بھی تو کیا سمجھ کر تمہاری سفارش کروں -

اگر تم شاعر بھی مکمل ہوتے، تو خیر ایک بات تھی، لیکن شاعری تمہارے یہاں نام ہے اُلجھے ہوئے بال، بڑھے ہوئے کثیف ناخن، گندے لباس، باچھوں تک پھیلی ہوئی پیک، منہ سے بیڑی کے بھپکوں، اور ایک ایک ہفتہ تک منہ نہ دھونے کا —— پھر تمہیں بتاؤ کہ جب خود مجھے تمہاری صورت و صحبت گوارا نہیں، تو ایک غیر شخص جس کو تم سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکر پسند کرے گا -

میں جانتا ہوں، تم سے دُنیا میں کوئی کام نہ ہوگا، اس لئے شکر کرو جب تک بیکار جینے کی فرصت تمہیں حاصل ہے، ورنہ جو کچھ نہ کرسکے اس کے لئے اب دُنیا میں جگہ کہاں !

---

کیا عرض کروں، آپ نے کس وقت مجھے یاد کیا -

گمنڈ کو ہے وہ بازوئے شست و بام بلند

اور پھر لطف یہ کہ "نا امیدی" میرے لئے گناہ !

آپ کی ہمت افزائی (دلداری کا لفظ میں نے قصداً استعمال نہیں کیا کہ نہ میں اس کا مستحق، نہ آپ اس کی عادی) کا شکریہ ادا ہو سکے یا نہ ہو سکے، لیکن مجھے تو اس کی کوشش کرنا ہی ہے اور اگر آپ کی خوشی یہی ہے کہ میں کمزوری کا اعتراف کر ہی لوں، تو لیجئے، یہ دستاویز اعتراف حاضر ہے۔ اس سے زیادہ اگر کچھ اور منظور ہے تو وہ بھی فرما دیجئے کہ

"خیالت دہد آئینہ جاں را صیقل"

میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ اگر آپ نے کبھی یہ الزام قایم کر دیا کہ آپ کے غم میں، میں مر کیوں نہ گیا تو پھر اعتراف و معذرت کی بھی گنجایش باقی نہ رہے گی!

---

سنئے صاحب، مجھے تعمیل ارشاد میں عذر نہیں، لیکن صرف اس حد تک کہ میں کہتا رہوں اور آپ سنتے رہیں۔ میں آپ کی ایک نہ سنوں گا اور اگر جنبش مژگاں تک کی زحمت مجھے دی گئی، تو فوراً لوٹ آؤں گا۔ اس میں شک نہیں وقت ضایع کرنا بھی بڑے لطف کی چیز ہے، لیکن اسکا تعلق اگر موت سے نہیں تو زندگی سے بھی نہیں ہے، بلکہ ان دونوں کے درمیان اس حالت سے ہے جسے انتہائی بے حسی کے عالم میں صرف ہاتھ پاؤں ڈال دینا کہہ سکتے ہیں۔ پھر اگر یہ فرصت مجھے آپ کے پاس بھی نصیب نہ ہوئی، تو میرا زاویۂ خلوت کیا بُرا ہے، جہاں کام کرنے کے بعد بھی میں ہمیشہ یہی محسوس کرتا رہتا ہوں کہ مجھے کوئی کام نہیں۔ آپ ہی کیوں نہ تکلیف فرمائیں؟

---

کسقدر عجیب بات ہے کہ جب میں مایوس ہو کر "ترک وفا" پر آمادہ ہوتا ہوں، ٹھیک اسی وقت پھر آپ کا خط آجاتا ہے اور میں پھر فریب میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ کھیل آخر کب تک کھیلا جائیگا

یا تو بیگانہ ہی رہئے، ہو جئے یا آشنا
یہ ادا کیا، آشنا گاہے، گہے نا آشنا

اس میں شک نہیں کہ جب کوئی خاص مدعا نہ ہو تو خط لکھنے کا سوال بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ لکھئے کیا؟ "ذوق خامہ فرسا" اور "عشق نام لیلیٰ" کا زمانہ تو ہے نہیں کہ چاہنے والا صرف اتنا کہکر بھی سب کچھ کر سکتا تھا کہ ــــ "ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے" ــــ اب اگر کوئی اس دور نکتہ چینی میں ایسا کہے تو اُسے "برائے نام عاشق" کہیں گے۔

بہر حال یہ عذر آپ کا واقعی معقول ہے کہ صرف "خیریت" کا خط لکھنا ہی کیا۔ لیکن اگر یہی عذر میری طرف سے ہو تو آپ فوراً کہدیں گی کہ "خیریت" آخر ہئی کیوں۔ محبت کرنے والوں کی دنیا میں یہ چیز پائی کب جاتی ہے جسکا ذکر کیا جائے۔ اس کا جواب میں کیا، افلاطون بھی نہیں دے سکتا۔ جسکی "Platonic love" کا ذکر آپ نے بھی سُنا ہوگا۔ اس لئے کیا کروں مجبور ہوں اور پھر عہد وفا استوار کئے لیتا ہوں۔ "فکر تعمیر نہیں، ماتم تخریب سہی!"

# تقاضا

چہرۂ وقت سے اب اُٹھتے ہیں صدیوں کے حجاب
آفتابوں کی تجسس میں ہے ظلمت بے تاب
دامِ ناہید و ثریا سے نگاہوں کو نکال
ڈالنا ہے تو کمندیں مہ و خورشید پہ ڈال
وہ لہو جس سے پیالوں میں کھنک ہے اب تک
جس سے تہذیب کے سینے میں دھڑک ہے اب تک
جو ٹپکتا ہے طرب ریز ربابوں سے وہ خوں
جس کی بو آج تک آتی ہے شرابوں سے وہ خوں
اب وہ خوں وقت کے رخسار پہ ملنا ہے تجھے
اُٹھ! کہ تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے

---

خون میں ڈوب چکے کتنی کلاہوں کے غرور
کتنے محلوں کی ہنسی، کتنے پیالوں کے سرور
مستی و کیف کو مرکز سے ہٹاتا ہوا چل
زہر ہر جام میں تھوڑا سا ملاتا ہوا چل
آگ ہر مسندِ زریں میں لگاتا ہوا چل
ہر شبستاں سے دُھواں ایک اُٹھاتا ہوا چل
کاہ و تاج کی عظمت کو مٹاتا ہوا چل،
ٹھوکریں اطلس و دیبا کو لگاتا ہوا چل
تیز چل تیز! کہ نادیدہ سفر اور بھی ہیں
منزلیں اور بھی ہیں راہگزر اور بھی ہیں
زلزلے راہ میں ہیں گوش بر آواز ابھی
برق و طوفاں ہیں ترے ہمدم و دمساز ابھی

تجھ کو جینا ہے تو ہنستے ہوئے جینا ہوگا
مُسکراتے ہوئے ہر زہر کو پینا ہوگا!!

پروفیسر شور، ام-اے

# صبحِ انقلاب

بزمِ جہاں کو زیر و زبر دیکھتا ہوں میں
برہم بساطِ شام و سحر دیکھتا ہوں میں

گلشن کی سرزمینِ مسرت قیام کو
آماجگاہ برق و شرر دیکھتا ہوں میں

پروردۂ خزاں ہے بہارِ خجستہ لے
سرو و سمن بہ رنگ دگر دیکھتا ہوں میں

دل تنگ و غرق خوں ہے ہر اک غنچۂ حسیں
ہر گل پہ مہرِ داغِ جگر دیکھتا ہوں میں

کون و مکاں میں پاتا ہوں روحِ فسردگی
جس سمت بھی اُٹھا کے نظر دیکھتا ہوں میں

یہ زورِ تند بادِ حوادث ہے الاماں
خود زندگی کو خاک بسر دیکھتا ہوں میں

ظلمت کے شہ نشین پہ سرچشمۂ بقا
بجھتا ہوا چراغِ خضر دیکھتا ہوں میں

روشن دلانِ دہر ہیں ظلمت کدہ میں گم
ناقدریٔ متاعِ ہنر دیکھتا ہوں میں

---

پاتا ہوں سنگ و خشت میں بالیدگی کا جوش
واماندگی کو گرمِ سفر دیکھتا ہوں میں

خورشید زرنگار سے لینے کو انتقام
شبنم کے دل میں رقصِ شرر دیکھتا ہوں میں

ہر ذرہ ہے حریفِ نجومِ فلک نشیں
ہر اشک کو رقیبِ سحر دیکھتا ہوں میں

بستاں کا ہر شگوفۂ محرومِ التفات
پروردۂ ہوائے اثر دیکھتا ہوں میں

پستی نے بامِ اوج پہ پھینکی ہے وہ کمند
ڈالے ہوئے فلک کو سپر دیکھتا ہوں میں

گرنے ہی کو ہے کنگرہ قصرِ خواجگی
دستِ تہی میں تیغِ ظفر دیکھتا ہوں میں

القصہ شرح کیجئے کیا، مختصر یہ ہے
بدلا نظامِ شمس و قمر دیکھتا ہوں میں

ہو خامشی نہ زمزمۂ صبحِ انقلاب!
تاریک شب میں نورِ سحر دیکھتا ہوں میں

حسن یحییٰ عندلیب میرٹھی

# سہارے

دل ضبطِ الم کرتا ہی رہا۔ پلکوں پہ نمی کچھ آ ہی گئی
بیتاب سہی کتنا ہی یہ دل ۔ اظہارِ تمنا کیا کرتا
اِس درد کی ماری دُنیا میں کب کون کسی کا ساتھی تھا
کیا جانے مجھے کیا یاد آیا۔ پھر آنکھ میں آنسو بھر آئے
وہ مجھ سے چھپا کے میری طرف دزدیدہ نگاہی کیا کہنا
برہم تھا زمانہ تو کیا تھا۔ اب تم ہو جو برہم تو کیا ہے

کچھ اُنکے تسلی دینے سے اشکوں کو سہارا مل ہی گیا
یوں کہیئے کہ اُن کی نظروں کا کچھ اسکو سہارا مل ہی گیا
اس یاس بھرے دل کو لیکن اِک غم کا سہارا مل ہی گیا
پھر اُن کے فریبِ سعی کرم کو ایک سہارا مل ہی گیا
اِس حُسن تغافل کے صدقے جینے کا سہارا مل ہی گیا
کچھ بھی ہو۔ وفاؤں کو میری اک در سہارا مل ہی گیا

سید علی سجاد مہر اکبر آبادی

---

## غزل : انجم رضوانی

نہ التجائیں کارگر ہوئیں نہ آنکھ کی نمی
یہ سانس لے رہا ہوں میں رُکی رُکی تھمی تھمی
میں راستے سے بے خبر نہیں ہوں ورنہ ہمسفر
خوشی کی آرزو نہ کر دلِ حزیں، کہ ہو چکی
کہیں نہ توبہ کی ہو انجم خراب حال نے

یہ میرے بخت کی کجی، مرے نصیب کی کمی
فسانہ بن رہے ہیں یوں تعلقات باہمی
یہاں لباسِ رہبری میں رہزنوں کی کیا کمی!
بس ابتدائے عشق ہی میں انتہائے خرمی
یہ میکدے پہ چھا رہا ہے کیوں سکوت ماتمی!

## غزل : نیساں اکبر آبادی

مری افسردگی کیا پوچھتے ہو پوچھنے والو
گئے ہیں جب سے وہ نیساں عجب عالم ہے اس دل کا

کہ ہوتی ہے سحر اور شام سی معلوم ہوتی ہے
کہ ہر شے بدمزہ۔ بے لطف سی معلوم ہوتی ہے

---

گو التفاتِ حُسن میں کچھ بھی کمی نہ تھی
ایسے بھی کچھ گزار دئے زندگی کے دن
تعبیر جس کو ہم نے تغافل سے کر لیا

صورت سکونِ قلب کی پھر بھی کوئی نہ تھی
تھا زندگی کا نام مگر زندگی نہ تھی
وہ امتحان عشق تھا کچھ بے رُخی نہ تھی

نیساں خوشی کے نام سے جو مسکرا دیا
تقدیر پہ وہ طنز تھا لب پر ہنسی نہ تھی

# نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

## جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

## فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:
۱— چند گمنام فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔
۲— مادیئین کا مذہب
۳— حرکت کے کرشمے
نہایت مفید و دلچسپ، کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

## شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

## فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

## مذاکرات نیاز

حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات [illegible] کا عجیب و غریب ذخیرہ [illegible] اس کو شروع کر دینا [illegible] لینا ہے۔ یہ بھی [illegible] جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ
علاوہ محصول

## نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیانِ طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ قاتل ہے زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے
علاوہ محصول

## انتقادیات دو حصے (زیر طبع)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کیگئی ہے مثلاً مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے ہر ایک حصہ پانچ پانچ سو صفحات سے کم نہ ہوگا اور ہر حصہ کی قیمت پانچ روپیہ ہوگی

## مذہبیات (زیر طبع)

حضرت نیاز کے تمام وہ بہترین مقالات جن میں انھوں نے مذہب و تعلقات مذہب کے اپنے خاص رنگ میں بحث کی ہے حضرت نیاز کے مضامین اس قدر دلچسپ اتنے مسکت و مدلل ہیں کہ ان کا جواب پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس مجموعہ میں تمام وہ مضامین ہونگے جنھوں نے دنیائے مذہب میں ہلچل ڈالدی تھی اور جنکے مطالعہ کو لوگ آنکھیں بند کئے ہیں۔ یہ بھی دو حصوں میں شایع ہونگے اور ہر حصہ کا حجم ۵۰۰ صفحات اور قیمت پانچ روپیہ ہوگی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۴۶۶

# "نگار" کے خاص نمبر

| جنوری ۱۹۳۹ء | جنوری ۱۹۴۰ء | جنوری ۱۹۴۱ء | جنوری ۱۹۴۲ء | جنوری ۱۹۴۳ء | جنوری ۱۹۴۴ء |
|---|---|---|---|---|---|
| (مصحفی نمبر)<br>اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:<br>حیات مصحفی۔ اردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ<br>قیمت دو روپے<br>علاوہ محصول | (نظیر نمبر)<br>اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:<br>نظیر کا مسلک ــــ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ<br>قیمت دو روپے<br>علاوہ محصول | یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزلگو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔<br>قیمت تین روپے<br>علاوہ محصول | اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۱۹۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔<br>قیمت دو روپے<br>علاوہ محصول | اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔<br>قیمت ایک روپیہ<br>علاوہ محصول | جدید شاعری نمبر<br>اس میں بتایا گیا۔ کہ جدید رجحانات شعر کی کیا حقیقت ہے ا آزاد نظم نگاری کا وقافیہ سے بےنیاز ہو کیا معنی رکھتا ہے<br>قیمت دو روپے<br>علاوہ محصول |

## نرخنامہ اُجرت اشتہار

| | ایک سال | چھ ماہ | تین ماہ | ایک ماہ |
|---|---|---|---|---|
| ایک صفحہ | ۲۰۰ روپیہ | ۱۱۰ روپیہ | ۶۰ روپیہ | ۲۰ روپیہ |
| آدھ صفحہ | ۱۱۰ روپیہ | ۶۰ روپیہ | ۳۵ روپیہ | ۱۲ روپیہ |
| چوتھائی صفحہ | ۶۰ روپیہ | ۳۵ روپیہ | ۲۰ روپیہ | ۷ روپیہ |

(۱) اُجرت بہرحال پیشگی لیجائے گی۔ ویپی وغیرہ کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں۔
(۲) جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اسکی رقم پیشگی کمیشن لی جائیگی
مابہ اوائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہے گا۔
(۳) اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا

منیجر

## "نگار" کی قیمت

سالانہ: ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ۔ ششماہی ہندوستان کے اندر تین روپ
" بیرون ہند آٹھ روپیہ۔ " بیرون ہند پانچ روپ
(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے۔
۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ بعد کو
۸ رنی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

منیجر

**حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے**

**خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا**

**تو تعمیل دشوار ہے**